سستی اور کاہلی کا علاج

سستی اور کاہلی کا علاج قرآن وحدیث کی روشنی میں

مؤلف/
الشیخ الدکتور ناصر بن سلیمان العُمر حفظہ اللہ

مترجم/
مولانا ضیاء الرحمٰن چترالی
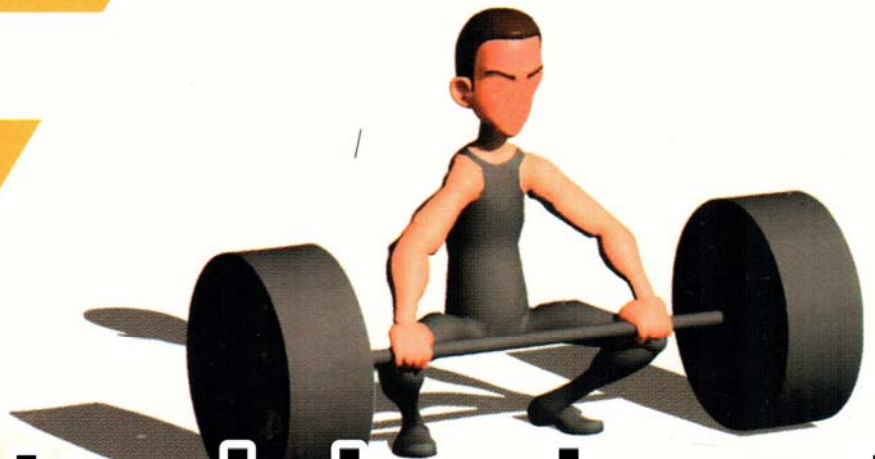
اللهمّ اجعل هذا القرآن ربيع قلبي

ادارہ دعوت وتبلیغ
IDARAH DAWAT-UL-TABLIGH

سُستی اور کاہلی

سستی اور کاہلی کا علاج اور نقصانات
قرآن وحدیث کی روشنی میں

مؤلف/
الشیخ الدکتور ناصر بن سلیمان العمر حفظہ اللہ
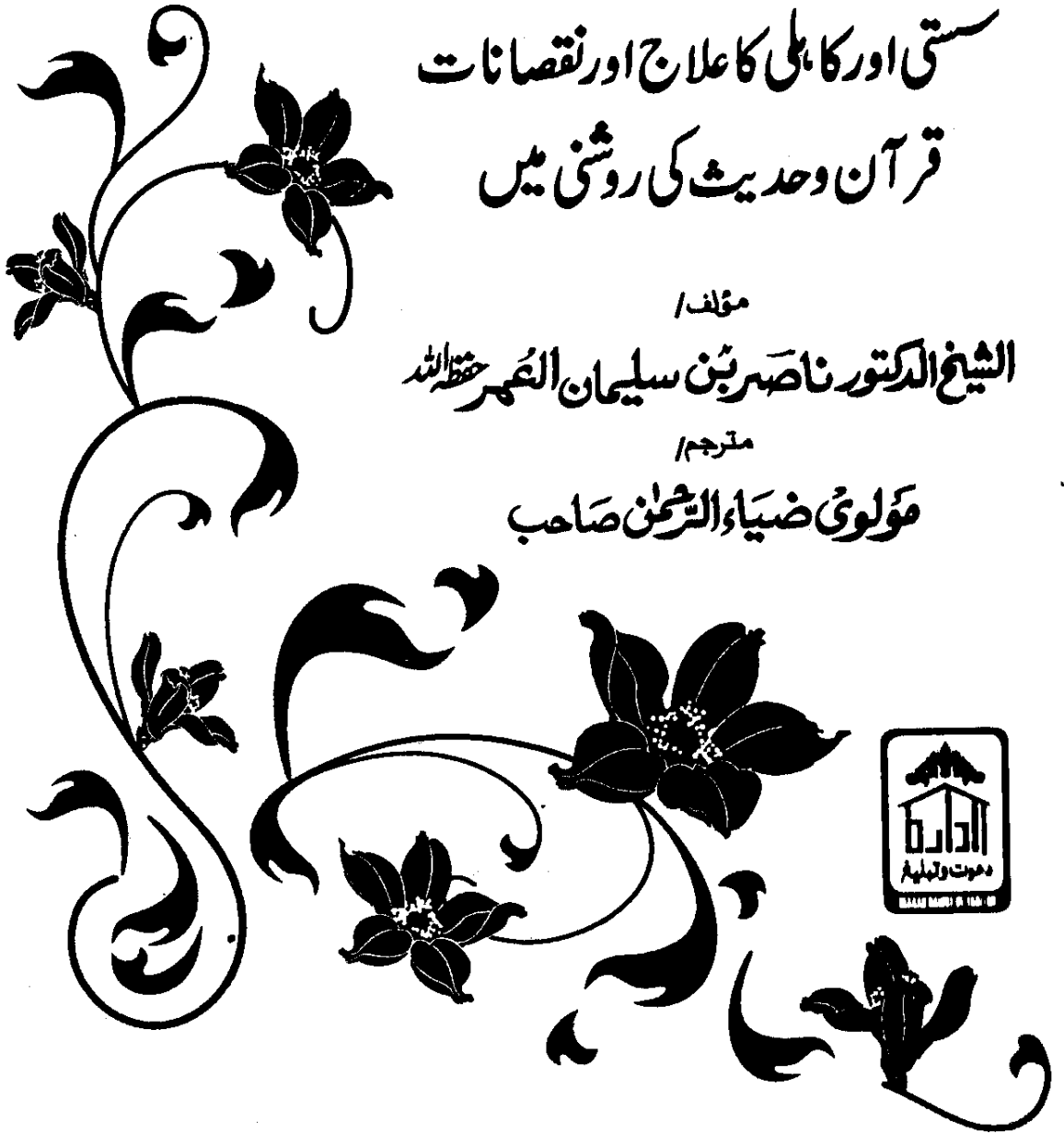
مترجم/
مولوی ضیاء الرحمٰن صاحب

نام کتاب .... سستی اور کاہلی

اشاعت اوّل .... فروری 2014ء

مولف .... الشیخ الدکتور ناصر بن سلیمان العمر حفظہ اللہ

مترجم .... مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب

باہتمام .... مولانا ابو عبدالرحمان نقشبندی

ناشر .... ادارہ دعورت وتبلیغ

قرآن محل مارکیٹ، دکان نمبر 13 اردو بازار کراچی۔ 0342-2046000

فہرست

باب نمبر: 8

باب نمبر: 9

عرض مترجم

رب تعالیٰ نے انسان کو جہاں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے وہیں اس کی فطرت اور شہرت میں ایسی خامیاں بھی ہیں جن پر اگر توجہ نہ دی جائے اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو انسان اپنے مقام انسانیت سے گر کر جانوروں کے زمرے میں آجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ انسان کو ضعیف اور کمزور پیدا کیا گیا ہے، اس طبعی ضعف اور کمزوری کی وجہ سے وہ جسمانی بیماریوں کے ساتھ روحانی اور معنوی یا باطنی بیماریوں کا بھی شکار ہوجاتا ہے، زیرنظر کتاب انہی باطنی یا معنوی بیماریوں میں سے ایک مہلک بیماری کی ہلاکت خیزیوں اور تباہ کاریوں سے مسلمانوں کو بچانے کی خاطر لکھی گئی ہے۔ وہ بیماری ہے سستی و کاہلی اور بے حسی۔

قارئین! یہ کتاب اس موضوع کے لحاظ سے ایک جامع اور کامل تالیف ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر اس مرض کا شکار ہے، اس کے مہلک اور تباہ کن ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن اس کے باوجود اس موضوع پر اب تک کسی نے مستقل کتاب نہیں لکھی، حالانکہ علماء و اسکالرز حضرات نے اس دور میں کسی موضوع کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، بلکہ ایک ہی موضوع پر کئی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر شیخ ناصر بن سلیمان سے پہلے کسی کو اس کی توفیق نہیں ملی۔ بہرحال یہ اللہ کا فضل ہے جس کو نوازنا چاہے نوازتا ہے۔

قارئین! سستی و کاہلی اور بے حسی ایک ایسی وبا ہے جس نے قوموں کو تباہی و

بربادی سے دوچار کیا ہے، آج افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غیر مسلم اقوام تو اپنی محنت جدوجہد اور کوششوں سے مریخ پر کمندیں ڈالنے کی تدبیریں کر رہی ہیں اور امت مسلمہ خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے، حال ہی میں اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے نے دنیا کے تمام ممالک کا سروے کر کے ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی ہے۔

اس رپورٹ میں سستی کے حوالے سے تمام ممالک کی درجہ بندی کی گئی ہے، اگرچہ سرفہرست دو نام اسلامی ممالک کے نہیں ہیں تاہم تیسرے نمبر پر اسلام کے مرکز یعنی سعودی عرب کو رکھا گیا ہے، سستی و کاہلی کے سبب بلڈ پریشر، شوگر اور موٹاپا جیسے خطرناک قسم کے امراض سعودی معاشرے میں عام ہوگئی ہیں، سستی کے سبب جہاں انسان عبادات چھوڑ کر آخرت کی دائمی نعمتوں سے محروم ہوتا ہے وہیں دنیوی اعتبار سے بھی اس کے نقصانات کا احاطہ کرنا مشکل ہے، سست انسان نہ دوسروں کے کسی کام آسکتا ہے اور نہ اپنا کوئی کام کرسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں اس نقصان دہ بیماری کے اسباب، اس کے مظاہر اور اس سے بچاؤ کی تدابیر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور سستی میں مبتلا افراد کے علاج کا مکمل طریقہ بتایا گیا ہے، اس لیے بلاشبہ یہ سستی و کاہلی کے مرض سے نجات دلانے میں ایک نسخہ کیمیا سے کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سستی و کاہلی سے بچائے۔ آمین۔

مترجم: ضیاء الرحمٰن چترالی

انتساب

میں اپنی یہ حقیر سی کوشش دین اسلام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے والے ان مجاہدین کے نام کرتا ہوں جنہوں نے سستی و کاہلی اور آسائش و سہولیات کو خیر باد کہہ کر میدانوں کا رخ کیا اور امت مسلمہ کے لیے روشن مستقبل بنا کر کفریہ طاقتوں کو دن میں تارے دکھائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت نصیب فرمائے۔

::مقدمہ::

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

الحمد لله نحمده سبحانه و نستعينه و نستغفره و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلل فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله و حده لا شريك له و اشهد ان محمدا عبده و رسوله صلى الله عليه و على آله وصحبه و سلم تسليما كثيرا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُو اتَّقوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (سورۃ آل عمران، آیت: 102)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ایسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنے کا حق ہے، اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اس حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْس وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا

(سورۃ النسآء: 1)

ترجمہ: ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ داریوں کی (حق تلفی سے) ڈرو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہا کرو۔ اللہ تمہارے فائدے کے لیے تمہارے کام سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے وہ کامیابی حاصل کر لی جو زبردست کامیابی ہے۔'' (سورۃ الاحزاب: 70، 71)

اما بعد! :

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان لکل عمل شرة و الشرة الی فترة فمن کانت فترته الی سنتی فقد اهتدی و من کانت فترته الی غیر ذلك فقد ضل" (مسند احمد)

ترجمہ: ''ہر عمل میں تیزی اور شدت ہوا کرتی ہے، پھر اس شدت، جوش اور تیزی کے بعد سستی یا کمزوری و ڈھیلا پن طاری ہو جاتی ہے، سو جس کا ڈھیلا پن میری سنت

کے مطابق ہو تو وہ ہدایت پائے گا اور جس کا ڈھیلا پن اس کے مطابق نہ ہو تو وہ گمراہ ہو جائے گا۔"

اس قسم کی بہت ساری احادیث مختلف اسناد و طرق سے منقول ہیں، ان سب کا مضمون اس قدر مشترک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تمام لوگوں کو سستی لاحق ہوتی ہے، چاہے وہ علم دین کے طلبہ ہوں یا دین کے داعی یا عام مسلمان۔

رسول کریم ﷺ نے بہت سی احادیث میں سستی اور کاہلی سے پناہ مانگی ہے، جیسے کہ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ پناہ مانگتے ہوئے فرماتے تھے:

"اللھم انی اعوذ بك من الكسل و الھرم و المأثم و المغرم"

ترجمہ: "اے اللہ! میں سستی سے، زیادہ بڑھاپے سے، گناہ میں مبتلا ہونے اور قرض دار ہونے سے تیری مانگتا ہوں۔"

(صحیح البخاری کتاب الدعوات، صحیح مسلم کتاب الذکر)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بارہا سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

"اللھم انی اعوذبك من الھرم و الحزن، والعجز، والكسل، والبخل، و الجبن، غلبة الدين، و قھر الرجال"

(صحیح البخاری، کتاب الجھاد)

ترجمہ: "اے اللہ! میں زیادہ بوڑھے ہونے سے، غمگین ہونے سے، عاجزی سے، سستی سے، بخل سے، بزدلی سے، قرضے تلے دبنے سے اور لوگوں کے غضب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

اس موضوع کی بے پناہ اہمیت، خصوصاً دین کے طالب علموں، داعیوں اور مربیوں کیلئے اس کی اشد ضرورت کے پیش نظر ایک عرصے سے میرے دل میں یہ آرزو مچل رہی تھی کہ ''سستی اور کاہلی'' کی مہلک بیماری کے حوالے سے کچھ قلم فرسائی ہو جائے اور کوئی کتاب تصنیف کی جائے، تو اس موضوع سے متعلق جو کچھ مجھے ملتا رہا۔ میں اسے جمع کرتا رہا، خود بھی اس حوالے سے غور وفکر کرتا رہا اور جو کچھ ذہن میں آیا لکھتا رہا اور دوسروں سے بھی استفادہ کرتا رہا، پھر لکھے ہوئے مواد اہل علم مشائخ اور طلبہ کرام کے سامنے پیش کرتا رہا اور ان کے مفید مشوروں سے بھی فائدہ اٹھاتا رہا اور ان کے بتائے ہوئے فوائد کو بھی قلم بند کرتا رہا۔

یوں کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد جا کر میں اس قابل ہو سکا کہ متفرق مواد کو یکجا کر کے ایک کتابی شکل دے سکوں اور اپنی دلی آرزو کو عملی جامہ پہنا سکوں، تو میں نے اسے مرتب کر کے مختلف دروس میں طلبہ کرام کے سامنے پیش کیا۔

پھر میں نے اپنے طلبہ سے بھی اس حوالے سے تعاون کا مطالبہ کیا کہ وہ بھی ''سستی و کاہلی'' سے متعلق کچھ لکھ کر لائیں، انہوں نے میری بات پر لبیک کہتے ہوئے کام شروع کیا اور میرے پاس درجنوں رسالے جمع ہو گئے۔

میں نے ان رسائل سے بھی بہت سی مفید باتوں کا انتخاب کیا اور مجھے ان سے بہت زیادہ فائدہ ہوا، اس کے بعد میرے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں ان جمع شدہ مواد کو مرتب کر کے کتابی شکل دے دوں، ان کے اس مشورے کو سن کر میرا بھی یہی ارادہ ہوا کہ اسے مسلمانوں کے فائدے کے لیے کتابی شکل میں شائع کرنا چاہیے۔ تو میں نے اللہ جل جلالہ سے مدد مانگتے ہوئے اس تحقیقی کام کو مرتب کر کے

کتابی شکل دے دی۔

اوراب میرے مسلمان بھائیو! وہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب کے شروع کرنے سے پہلے میں اس موضوع سے متعلق کچھ معروضات اور کچھ اشارات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں:

(۱) یہ ایک ایسا علمی موضوع ہے، جس پر مزید تحقیقی کام ہوسکتا ہے، جس میں سستی و کاہلی کے مزید اسباب اور اس کے علاج کے مزید طریقے بھی دریافت کئے جاسکتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ سارے اسباب اور علاج کے سارے طریقے اس کتاب میں بیان کیئے گئے ہوں۔

(۲) یہ کتاب میں نے ان لوگوں کی خاطر تصنیف نہیں کی ہے، جنہیں سستی و کاہلی کا مرض لاحق ہے، بلکہ میں نے تو طالب علموں، داعیوں، مربیوں اور دین سے وابستہ نوجوانوں کے لیے اسے تصنیف کیا ہے، کیونکہ میرے مشاہدے کے مطابق یہی لوگ آخر کار سستی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ دینی تربیت کرنے والے اساتذہ، مربیوں اور دینی تربیت پانے والے طلبہ کرام کے لیے لازم ہے کہ وہ اس بیماری کی حقیقت کو جان لیں، تاکہ وہ اپنے نفس کی اس کی ہولناکیوں اور مضر اثرات سے بچ سکیں، چونکہ کسی مرض میں مبتلا ہوکر علاج کرانے کی بہ نسبت حفظ ماتقدم اور پرہیز اپنا کر اپنے آپ کو اس مرض سے بچانا زیادہ آسان ہوا کرتا ہے۔

(3) میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اس موضوع سے متعلق اس انداز سے لکھوں کہ اس سے مقصود کا حصول آسان تر ہوجائے، اس لیے میں نے کئی سال اس

کی ترتیب اور تصنیف میں لگا دیئے، ساتھ میرے کئی ایسے دوست بھی میرے ساتھ تعاون کرتے رہے، جو علمی میدان کے شہسوار ہیں، اسی طرح بہت سے طلبہ کرام اور دین کے داعیوں سے استفادہ کیا، ان حضرات کی تعداد درجنوں میں ہے، جو میری لکھی متفرق تحریروں کو ملاحظہ کرتے رہے۔

اس کے باوجود یہ ایک نیا موضوع ہے، اس میں مزید اضافہ اور تحقیق ہوسکتی ہے، چونکہ میں ایک انسان ہونے کے ناطے کمی اور کمزوری سے خالی نہیں ہوں، ممکن ہے کہ بہت کچھ اس موضوع سے متعلق رہ گیا ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے اس کتاب کی تصنیف میں میرے ساتھ کسی لحاظ سے بھی تعاون کیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بخشش فرمائے جنہوں نے کمی کوتاہی کو دیکھتے ہوئے بھی مجھے مطلع نہیں کیا۔

اس لیے اس کتاب میں کوئی کمی کوتاہی یا غلطی ہوگئی ہو تو اس حوالے سے میں رب تعالیٰ سے معافی اور قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

ان تجد عیبا فسد الخلل

جل من لا عیب فیہ وعلا

ترجمہ: ''اگر آپ کو کوئی کمی کوتاہی نظر آئے تو اس کمی کو پورا کریں، اس لیے کہ کمی کوتاہی اور عیوب سے پاک ایک ہی ذات ہے یعنی اللہ جل جلالہ کی۔''

(4): سستی و کاہلی کے اسباب، مظاہر اور علاج کے بیان میں، میں نے اہمیت کے اعتبار سے ترتیب قائم نہیں کی ہے، کہ سب سے اہم کو سب سے پہلے رکھوں اس کے بعد کم اہمیت والے اسباب یا مظاہر یا علاج کے طریقوں کو بیان کروں، ایسا

نہیں ہے، بلکہ مذکورہ تینوں اشیاء کو جیسے تیسے جمع کیا گیا ہے، کیونکہ افراد و احوال کے اعتبار سے بسا اوقات ایک چیز اہم ہوتی ہے اور کبھی کوئی دوسری چیز۔

(5): کتاب میں بعض دفعہ آپ کو تکرار بھی نظر آئے گی، کہ ایک ہی سبب یا علاج کے طریقے یا ایک ہی مظہر کو بار بار ذکر کیا گیا ہے، تو یہ تکرار بلا وجہ نہیں ہے، اس کی کچھ علمی وجوہات ہیں۔ ویسے بھی ہر تکرار بری چیز نہیں ہے، تکرار وہ مذموم ہے، جو فائدے سے خالی ہو، خود قرآن کریم میں بھی بعض چیزوں کو مکرر ذکر کیا گیا ہے، جیسے کہ سورۂ رحمٰن میں:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

ترجمہ: ''تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

کی آیت بار بار دہرائی گئی ہے اور بہت سے قصے بھی مکرر بیان کئے گئے ہیں، کیونکہ ہر جگہ یہ کسی فائدے سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہ تکرار مذموم بھی نہیں، بلکہ یہ تو ممدوح اور مستحسن ہے۔

مقدمے کے آخر میں، میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ناکارہ کو یہ توفیق مرحمت فرمائی اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، میں رب تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو نفع پہنچائے اور اسے خالص اپنی رضا کے لیے بنادے۔ اسے میرے لئے دنیا میں معاون اور آخرت کا ذخیرہ بنادے کہ اس دن نہ تو کوئی مال و دولت کام آئے گی اور نہ ہی اولاد، اگر کوئی چیز کام آسکتی ہے تو وہ خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا ہوا عمل ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ میری کمی کوتاہی اور لغزشات سے

درگزر فرمائے۔ میں پھر دوبارہ ان دوستوں اور طلبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی تصنیف میں میرے ساتھ تعاون فرمایا اور جنہوں نے اس کتاب کی احادیث کی تخریج کی اور اس پر کام کرتے رہے یہاں تک کہ یہ چھپنے کی پوزیشن میں آ گئی اور اب چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله و صحبه اجمعين۔

ناصر بن سلیمان العمر

الریاض، ۲۷/۵/۱۴۱۴ھ بروز جمعرات

باب نمبر:1

موضوع کی اہمیت

سستی وکاہلی کا موضوع کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل باتوں سے لگایا جاسکتا ہے:

(1) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں منافقین کی اس بات پر مذمت فرمائی ہے کہ نماز ان کے لیے ایک بوجھ تھی، وہ اس میں کاہلی اور سستی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی میں بھی ان کا یہی حال تھا کہ دل سے نہ چاہتے ہوئے مجبوراً زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے، چونکہ نماز اور زکوٰۃ جیسی اہم ترین عبادات میں بھی سستی وکاہلی کا مظاہرہ کرنا سستی کی انواع واقسام میں سے بدترین قسم ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَّلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ

ترجمہ: ''اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے (سورة التوبه: 54)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (سورة النساء: 142)

ترجمہ: ''اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو تھوڑا

ہی یاد کرتے ہیں۔‘‘

منافقین کے علاوہ سستی پر مسلمانوں کو بھی ڈانٹا گیا ہے۔ارشاد خداوندی ہے کہ:

یَآ یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ (سورۃ التوبہ:38)

ترجمہ:’’اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ اللہ کے راستے (جہاد کے لیے) کوچ کرو تو تم بوجھل ہو کر زمین سے لگ گئے۔‘‘

ظاہر بات ہے کہ بوجھل ہونا اور زمین سے چمٹ جانا سستی و کاہلی ہی کی وجہ سے تو ہوتا ہے۔

(2) اللہ تعالیٰ نے سستی و کاہلی کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے، وہ اس طرح کہ قرآن کریم میں نیک کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان مومنین کی تعریف کی گئی ہے جو نیکی کے کاموں میں آگے بڑھتے ہیں اور دوسروں کو پیچھے چھوڑتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ آگے وہی بڑھ سکتا ہے جو سست و کاہل نہ ہو، کاہل انسان کسی سے مقابلہ کر کے اسے پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (سورۃ آل عمران: 133)

ترجمہ:’’اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور جنت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام آسمان اور زمین سما جائیں اور وہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔‘‘

دوسری جگہ ارشاد ہے:

سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ

ترجمہ: ”ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین کی چوڑائی جیسی ہے۔“ (سورۃ الحدید: 21)

نیک کاموں میں آگے بڑھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَات

ترجمہ: ”نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔“

نیکیوں میں سبقت لے جانے کی صفت پر انبیائے کرام علیہم السلام کی تعریف کی گئی اور ارشاد ہوا:

اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا وَ کَانُوْا لَنَا خٰشِعِیْنَ (سورۃ الانبیاء: 90)

ترجمہ: ”یقیناً یہ لوگ بھلائی کے کاموں میں تیزی دکھاتے ہیں اور ہمیں شوق و رعب کے عالم میں پکارا کرتے ہیں اور ان کے دل ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔“

سورۃ الواقعہ میں بھلائیوں اور ایمان میں سبقت لے جانے والوں کی مدح سرائی کی گئی اور ارشاد ہوا:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ٥ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ (سورۃ الواقعۃ: 10،11)

ترجمہ: ''اور جو سبقت لے جانے والے ہیں تو وہ ہیں ہی سبقت لے جانے والے! وہی ہیں جو اللہ کے مقرب بندے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ سستی بہت بری چیز ہے کیونکہ سست انسان کسی کام میں سبقت نہیں لے جا سکتا، سبقت لے جانے کے لیے سستی کی چادر اتارنی پڑے گی۔

(3) رسول کریم ﷺ نے سستی و کاہلی سے پناہ مانگی ہے، یہ مضمون کئی صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے۔ ان احادیث میں سے ایک تو وہ ہے، جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ سستی اور کاہلی سے پناہ مانگتے ہوئے فرمایا کرتے تھے

اللھم انی اعوذبك من الھرم و الحزن، والعجز، والکسل، والبخل، و الجبن، غلبة الدین، و قھر الرجال

ترجمہ: ''اے اللہ! میں زیادہ بوڑھے ہونے سے، غمگین ہونے سے، عاجزی سے، سستی سے، بخل سے، بزدلی سے، قرضے تلے دبنے سے اور لوگوں کے غضب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (صحیح البخاری، کتاب الجھاد)

رسول کریم ﷺ نے بہت سی احادیث میں سستی اور کاہلی سے پناہ مانگی ہے، جیسے کہ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ پناہ مانگتے ہوئے فرماتے تھے:

اللھم انی اعوذ بك من الکسل و الھرم و المأثم و المغرم

(صحیح البخاری کتاب الدعوات، صحیح مسلم کتاب الذکر)

ترجمہ: ''اے اللہ! میں سستی سے، زیادہ بڑھاپے سے، گناہ میں مبتلا ہونے اور

قرض دار ہونے سے تیری مانگتا ہوں۔"

رسول کریم ﷺ صبح و شام سستی سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ جیسے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت امام مسلم نے نقل کی ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الذکر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں تمہیں وہی بات بتاتا ہوں، جو رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے، ارشاد فرماتے:

اللھم انی اعوذبك من العجز و الکسل والجبن و البخل

ترجمہ: "اے اللہ! میں عاجز ہونے سے، سستی، بزدلی اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

(مسلم، کتاب الذکر)

(4): سستی و کاہلی کے نقصانات: سستی اور کاہلی کی سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کسی کام کو ثابت قدمی سے انجام نہیں دے سکتا، سستی بہت سی عبادات اور اعمال سے انحراف کا باعث بنتی ہے۔

اس وجہ سے یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے، اس کے خطرناک ہونے کی سب سے بڑی اور قطعی دلیل رسول کریم ﷺ کا صبح و شام اس سے پناہ مانگنا ہے کہ آپ ہمیشہ اس سے خود بھی پناہ مانگتے تھے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس مہلک بیماری سے پناہ مانگنے کا حکم فرمایا کرتے تھے، جیسے کہ احادیث گزر چکی ہیں۔

(5): سستی و کاہلی کی بیماری کسی ایک خاص جماعت یا گروہ کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ یہ جب کسی قوم میں پھیلتی ہے تو کسی ایک عمر کے لوگ کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی، بلکہ ہر عمر کے افراد اس وبا میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مگر جسے اللہ بچانا چاہے وہی بچ سکتا ہے۔

اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہی ہوتے ہیں، سستی کی وبا جب پھیلتی ہے تو علماء، طلبہ، عبادت گزاروں، عوام، شیوخ، نوجوانوں، مردوں، عورتوں، امیروں، غریبوں، تندرستوں، بیماروں، پرہیزگاروں، فاسقوں غرض زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ہر عمر والے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، تاہم اس وبا میں مبتلا ہونے کا انداز ہر ایک کا جدا جدا ہوسکتا ہے اور کسی کو شدید متاثر کرتی ہے اور بعض کچھ کم متاثر ہوتے ہیں اور ہر ایک کے اس میں مبتلا ہونے کے اسباب بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

(6): علم دین کے طالب علم، دین کے داعی اور مربی حضرات اس موضوع کی حقیقت سے واقفیت کی طرف سب سے زیادہ محتاج ہیں، اس لیے ان کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی تھی، جس میں سستی و کاہلی کی حقیقت، اس کے مظاہر و اسباب، اس کے علاج اور اس سے بچنے کے طریقے بیان کئے جائیں تا کہ وہ ان چیزوں کی معرفت کے بعد اپنے طلبہ اور عوام کی تربیت آسانی سے کرسکیں اور وہ کتاب اس بیماری کے علاج میں ان کے لیے مدد و معاون ثابت ہو سکے اور جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں ان کا علاج ہو سکے اور جو بچے ہوئے ہیں ان کے لیے مزید بچنا آسان ہو جائے۔

اس طرح یہ رسالہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک پیغام ہے، جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چاہے ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو اور وہ عمر کے کسی بھی حصے میں ہوں۔

مجھے تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسا رسالہ یا کتاب نہیں ملی جو سستی و کاہلی کے موضوع پر تحریر کی گئی ہو اور وہ اس مقصد کو پورا کرے اور اس میں سستی کی وبا کے حوالے

سے تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہو، بلکہ میں نے دیکھا کہ جتنے بھی رسائل اس حوالے سے لکھے گئے ہیں وہ اس موضوع کے کسی ایک حصے سے ہی متعلق ہیں، جبکہ ان میں بہت زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

تاہم وہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہیں، ان کے مصنفین کو اس موضوع پر پہلے قلم اٹھانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اور ان رسائل سے اس کتاب میں، میں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے، لیکن جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ کتاب بھی اس موضوع پر ہر لحاظ سے جامع اور کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر مزید کام بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود جیسے کہ میں نے کہا موضوع کی اہمیت اور طوالت کے اعتبار سے پھر بھی کافی نہیں تھے اور ان رسائل و کتب میں بہت سارے ان سوالات کے جوابات بھی تشنہ چھوڑ دیئے گئے تھے، جو عام طور پر اٹھائے جاتے ہیں اور دعوت و تبلیغ اور دینی تربیت کرنے والے حضرات کو ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال پھر بھی انہوں نے علمی کام کیا اور محنت کی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ میری یہ کتاب ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے، اس کے پڑھنے سے اس موضوع پر لکھی گئی دوسری کتب یا جو کتب بعد میں لکھی جائیں گی، انسان ان سے مستغنی ہو جائے گا، بلکہ یہ تو ایک کوتاہ دامن شخص کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جو کسی صورت میں کمال کا دعویٰ نہیں کر سکتا، کمال اللہ جل جلالہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔

باب نمبر:2

فتور یعنی سستی اور کاہلی کی تعریف

فتور عربی زبان کا لفظ ہے، جس کی تعریف ومعنی کے بارے میں علمائے لغت کے مختلف اقوال ہیں، ان علمائے کرام کی عبارتیں تو مختلف ہیں، لیکن قدر مشترک اور مفہوم سب کا ایک ہے، ان میں سے بعض اقوال کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں۔

صاحب مختار الصحاح کے نزدیک سستی وکاہلی کی تعریف

چنانچہ مختار الصحاح کے مصنف نے فتور (سستی) کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الفترۃ الانکسار و الضعف یعنی فتور سستی، بے حسی، ڈھیلا پن اور کمزوری کو کہتے ہیں۔ (مختار الصحاح مادۃ "فتر")

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ کی تعریف

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انسان جب شراب یا کوئی نشہ آور چیز استعمال کرتا ہے تو اس کے بدن پر سستی طاری ہوجاتی ہے اور وہ لڑکھڑانے لگتا ہے، اس کیفیت کو فتور کہتے ہیں۔ یہ کمزوری اور ڈھیلا پن ہے۔ (النهایہ لابن اثیر، 408/3)

امام راغب رحمہ اللہ کی تعریف

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فتور تیزی اور شدت کے بعد طاری ہونے والے سکون کو کہتے ہیں، اسی طرح شدت کے بعد نرمی کو بھی فتور کہتے ہیں، قوت کے بعد ضعف وکمزوری کو بھی فتور کہتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ (سورة المائدة: 19)

ترجمہ: ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر ایسے وقت دین کی وضاحت کرنے آئے ہیں جب پیغمبروں کی آمد رکی ہوئی تھی۔''

یعنی رسولوں کی آمد کے سلسلے میں کچھ توقف اور سکون کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری رسول ﷺ بھیجا۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَا يَفْتُرُوْنَ (سورة الانبياء: 20)

یعنی وہ اپنی عبادت میں چستی اور نشاط میں کوئی کمی نہیں لاتے، بلکہ ہمیشہ چست اور چاک و چوبند رہ کر عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ (المفردات فی غریب القرآن: ص371)

احب لسان العرب علامہ ابن منظور رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف

علامہ ابن منظور رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ فتور کسی عمل میں شدت کے بعد نرمی اور قوت کے بعد ضعف و کمزوری آنے کو کہتے ہیں۔ (لسان العرب: مادة "فتر")

علمائے لغت کے ان اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے فتور (سستی و بے حسی یا کاہلی) کے معنی کے حوالے سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ فتور (سستی) کی تعریف میں ڈھیلا پن، سستی، کمزوری، کسی عمل میں چستی نہ دکھانا، چاک و چوبند نہ ہونا اور بے حس ہو جانا وغیرہ سب داخل ہیں۔ (آفات على الطريق: 9/1)

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سستی وکاہلی کی تعریف

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''فتور'' (تھکاوٹ وسستی) کسی چیز کو اپنے لیے بھاری محسوس کرنے اور کسی چیز سے محبت ولگاؤ کے بعد اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے دور بھاگنے کو کہتے ہیں۔ (فتح الباری: ۱/126)

یہ فتور (سستی وکاہلی، کمزوری، ڈھیلا پن اور بے حسی) ایک ایسی بیماری ہے، جو بعض عبادت گزاروں، دین کے داعیوں اور طلبہ کو لاحق ہو جاتی ہے، جس کے بعد انسان سست پڑ جاتا ہے اور ہر وقت تھکا ماندا نظر آتا ہے، جس کے بعد وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ کسی مقصد کے حصول کے لیے محنت نہیں کر سکتا۔

باب نمبر:3

سستی وکاہلی کی اقسام

سستی وکاہلی اور بے حسی کی اقسام بے شمار ہیں، سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے، لیکن ہم یہاں اس کی بڑی بڑی چند اقسام کو ذکر کرتے ہیں اور کتاب کے موضوع کے اعتبار سے جو اقسام اہم ہیں، انہی کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

سستی وکاہلی کی پہلی قسم

(1) سستی وکاہلی کی پہلی قسم یہ ہے کہ انسان تمام عبادات اور ہر قسم کی طاعات اور نیکی کے کاموں میں سستی کا مظاہرہ کرے، کسی عبادت میں بھی اسے دلچسپی نہ ہو، پہلے تو عبادت کر ہی نہیں کرسکتا، اگر کر بھی لے تو اس میں اسے کوئی رغبت اور دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ عبادت سے اس کو ایک طرح کی نفرت ہوتی ہے۔

یہ قسم منافقین کے ساتھ خاص ہے اور منافقین تمام لوگوں میں عبادات کے حوالے سے زیادہ سست وکاہل اور عدم دلچسپی کا اظہار کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُ وْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهِ اِلَّا قَلِيْلاً

ترجمہ: ’’یہ منافق لوگ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں

تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔" (سورة النساء:142)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (سورة التوبة:81)

ترجمہ: "جن لوگوں کو (غزوۂ تبوک سے) پیچھے رہنے دیا گیا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کے جانے کے بعد اپنے (گھروں میں) بیٹھے رہنے سے بڑے خوش ہوئے اور ان کو یہ بات ناگوار تھی کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان سے جہاد کریں اور انہوں نے کہا تھا کہ: "اس گرمی میں نہ نکلو!" تو کہہ کہ: "جہنم کی آگ گرمی میں کہیں زیادہ سخت ہے!" کاش! ان لوگوں کو سمجھ ہوتی۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ

ترجمہ: "اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر بے دل سے" (سورة التوبة:54)

جناب رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اثقل الصلاة على المنافقين صلاة العشاء و صلاة الفجر ؑ و لو

یعلمون ما فیهما، لا توهما و لو حبوا

ترجمہ: ''منافقین پر سب سے مشکل اور گران نماز عشاء اور فجر کی نماز ہے، اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ان دونوں نمازوں میں کیا کچھ (اجر و ثواب) ملتا ہے تو وہ گھٹنوں کے بل پر گھسٹتے ہوئے بھی ان میں حاضر ہو جاتے۔'' (صحیح البخاری، کتاب الاذان و مسلم کتاب المساجد)

مذکورہ حدیث میں ان دونوں نمازوں کو سب سے زیادہ ثقیل اور بھاری قرار دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر عبادات اور نمازیں بھی منافقین کے لیے ثقیل اور بھاری ہیں، لیکن فجر اور عشاء کچھ زیادہ ہی ثقیل ہیں، مطلب یہ کہ صرف یہی دو ثقیل نہیں، بلکہ باقی عبادات بھی ثقیل ہیں۔

سستی و کاہلی کی دوسری قسم

(2) بعض عبادات اور نیکی و طاعت کے بعض کاموں میں سستی کرنا اور دلچسپی نہ لینا، لیکن ان عبادات سے کوئی نفرت اور کراہیت نہ ہو، یا رغبت و دلچسپی تو ہو لیکن سستی کی وجہ سے زیادہ رغبت کا اظہار نہ کر سکے۔ یہ مسلمانوں میں سے زیادہ تر فساق و فجار اور شہوت پرست لوگوں کا حال ہے۔

مذکورہ بالا دونوں اقسام کی سستی و کاہلی کا سبب دل کی ایک بیماری ہے اور یہ بیماری بعض لوگوں میں زیادہ ہوتی اور بعض میں کچھ کم ہوتی ہے، اس کا دارو مدار لوگوں کے احوال پر ہے، تو منافقین کی بیماری بہت زیادہ شدید اور نا قابل علاج ہے، اس کے مقابلے میں مسلمان فساق و فجار اور شہوت پرستوں کی بیماری کچھ ہلکی ہے، لیکن یہ چونکہ دل کی روحانی بیماری ہے۔

اس کا جسمانی بیماری یا کمزوری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ روحانی بیمار جسمانی اعتبار سے خوب صحت منداور ہٹے کٹے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا رَأَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (سورة المنافقون: 4)

ترجمہ: ''اور جب تم ان کو دیکھو تو ان کے جسم تمہیں بہت اچھے لگیں۔''

لیکن اس جسمانی تندرستی اور صحت کے باوجود ان کے دل بیمار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (سورة البقرة:10)

ترجمہ: ''ان کے دلوں میں روگ ہے، چنانچہ اللہ نے ان کے روگ میں اور اضافہ کردیا ہے۔''

سستی وکاہلی کی تیسری قسم

(3) یہ وہ سستی وکاہلی ہے جو بہت عام ہے اور اس کا سبب کوئی روحانی بیماری نہیں ہوا کرتی، بلکہ اس کا تعلق جسم سے ہوا کرتا ہے، اس سستی کی وجہ سے انسان کے دل میں عبادت وطاعت سے کراہیت یا نفرت نہیں ہوتی، بلکہ رغبت ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اگر عبادت اس سے نہیں ہوتی تو وہ پریشان بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ سست وکاہل ہی رہتا ہے، ہر رات کو وہ تہجد کے لیے اٹھنا چاہتا ہے، لیکن کسی رات کو بھی تہجد نہیں پڑھتا، باوجودیکہ وہ جاگتا ہے۔ وہ ہمیشہ ارادہ کرتا ہے کہ میں ماہوار قرآن ختم کیا کروں گا، لیکن اس پر کئی مہینے گزر جاتے ہیں مگر قرآن

ختم نہیں کر پاتا، اسے نفلی روزے رکھنے کی بھی خواہش ہوتی ہے، لیکن رکھ نہیں پاتا۔

اس قسم کی سستی میں تقریباً تمام مسلمان مبتلا ہیں، ان میں کچھ صالح لوگ بھی شامل ہیں اور بہت سے فساق و فجار اور خواہش پرست بھی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (سورة التوبة: 38)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ اللہ کے راستے (جہاد کے لیے) کوچ کرو تو تم بوجھل ہو کر زمین سے لگ گئے۔''

سستی کی اس بیماری میں مبتلا افراد کو یہ بیماری بسا اوقات دوسری قسم کی طرف بھی لے جاتی ہے، یعنی یہ جسمانی بیماری آہستہ آہستہ قلبی بیماری میں تبدیل ہو سکتی ہے، اگر بروقت علاج نہ کرایا جائے تو یہ مسلمان بھی منافقین کی طرح بعض عبادات سے نفرت و کراہیت محسوس کرنے لگ جائے گا، لہٰذا اس کا بروقت علاج کرانا چاہیے۔

سستی و کاہلی کی چوتھی قسم

(4) وقتی اور عارضی سستی، جو کسی ایسے سبب کی وجہ سے لاحق ہو جو انسان کو معلوم ہے، یہ سستی ہمیشہ طاری نہیں ہوتی، بلکہ عارضی اور وقتی ہوا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان عبادات کو بھی نہیں چھوڑتا اور نہ کسی معصیت و گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسے کہ کوئی بھاری کام کرنے کے بعد بدن پر سستی و تھکاوٹ کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں یا طویل سفر کے بعد ایسا ہوتا ہے، یا بیماری کی وجہ سے انسان سست و کاہل ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی سستی و کاہلی سے کوئی انسان خالی نہیں ہے، تاہم اس حوالے سے لوگوں

کی مختلف قسمیں ہیں، اس کا سبب چونکہ عارضی ہوتا ہے، اس لیے سبب کے ختم ہو جانے کے بعد سستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

کیا سستی و کاہلی کی مذکورہ قسم قبیح یا نقصان دہ ہے؟

سستی کی اسی قسم کا ذکر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کیا ہے۔ جیسے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح مسلم میں حضرت حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ جو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں میں سے تھے، ان کی ایک روایت نقل کی ہے:

وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا: حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا: حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سبحان اللہ! یہ کیا بات کر رہے ہو؟

میں نے کہا کہ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہوتے ہیں تو آپ جنت و جہنم کا تذکرہ فرما کر ہمیں نصیحت کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ گویا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے جنت و جہنم کو دیکھ لیا، لیکن جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی سے باہر سے نکلتے ہیں تو ہم اپنی بیویوں اور اولاد کے ساتھ مگن ہو جاتے ہیں تو ہم غافل ہو کر بہت سی باتوں کو بھول جاتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ تو اس کے بعد میں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی بات عرض کی جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے کہی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں

میری جان ہے، اگر تمہاری وہی حالت ہمیشہ برقرار رہے جو میرے پاس ہوتے ہوئے اور نصیحت کے وقت ہوتی ہے تو تمہارے بستروں اور راستوں پر فرشتے تم سے مصافحہ کیا کریں، لیکن اے حنظلہ! اصل بات یہ ہے کہ یہ حالت کبھی کبھار ہی ہوتی ہے، آپ نے تین بار یہ بات ارشاد فرمائی۔'' (صحیح مسلم، کتاب التوبہ)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: قیام اللیل (تہجد کی نماز) کو مت چھوڑو، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے نہیں چھوڑا کرتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوتے یا سستی طاری ہو جاتی تو بیٹھ کر بھی تہجد پڑھا کرتے تھے۔

(ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ، مسند احمد، 6/249)

معلوم ہوا کہ سستی یہ قسم کوئی قبیح یا نقصان دہ نہیں ہے، اس لیے اس کتاب میں اس قسم کی سستی پر کوئی بات نہیں ہوگی، کیونکہ یہ ایک طبعی اور فطری چیز ہے، اس سے کوئی انسان حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی خالی نہیں ہوتے۔

اسی طرح سستی و کاہلی کی پہلی قسم پر بھی کوئی بات نہیں ہوگی، کیونکہ اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تو منافقین کی خاصیت ہے یا ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جن کے اندر منافقت کی کوئی علامت پائی جائے۔ اس لیے ہم اس کتاب میں اپنی گفتگو کا مدار دو قسموں یعنی دوسری اور تیسری قسم پر رکھیں گے اور انہیں کے حوالے سے آگے بحث کریں گے۔

باب نمبر:4

فتور (سستی وکاہلی) کا ذکر قرآن کی روشنی میں

فتور (سستی) کا لفظ یا اس کے ہم معنی الفاظ قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں، ان نصوص میں سے ہم آگے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں، اس پر مزید تفصیلی روشنی آگے اسباب کے بیان میں ڈالی جائے گی۔

(1) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (سورة الانبياء: 20)

ترجمہ: ''وہ دن رات اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔''

یعنی فرشتے اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے میں ذرہ بھی سستی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

(2) دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا:

يسبحون له باليل و النهار و هم لا يسئمون (سورة فصلت: 38)

ترجمہ: ''وہ رات دن اس کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور وہ اکتاتے نہیں ہیں۔''

(3: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَسْئَمُوٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ

ترجمہ: ''اور جو معاملہ اپنی معیاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اکتاؤ نہیں۔'' (سورة البقرة:282)

(4) اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

لا يسئم الانسن من دعاء الخير (سورة فصلت:49)

ترجمہ: ''انسان اپنے فائدے کی دعا سے نہیں اکتاتا۔''

(5) جہنمی مجرموں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

لَا يُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ (سورۃ الزخرف: 75)

ترجمہ: ''وہ عذاب ان کے لیے ہلکا نہیں پڑنے دیا جائے گا اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔''

(6) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ (سورۃ المائدہ:19)

ترجمہ: ''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر ایسے وقت دین کی وضاحت کرنے آئے ہیں جب پیغمبروں کی آمد رکی ہوئی تھی۔''

(7) فتور کا ہم معنی لفظ اس فرمان الٰہی میں استعمال ہوا ہے:

وَمَا ضَعُفُوۡا وَ مَا اسۡتَكَانُوۡا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ

ترجمہ: ''(اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر اللہ والوں نے جنگ کی) نتیجتاً انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہنچیں ان کی وجہ سے انہوں نے نہ ہمت ہاری، نہ کمزور پڑے اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا، اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔'' (سورۃ آل عمران:146)

یہ تو آیات قرآنیہ کی چند مثالیں تھیں، اس حوالے سے احادیث بھی بہت زیادہ ہیں، چند ایک ایسی احادیث مقدسہ کا ذکر کرتے ہیں، جن میں یہ لفظ یا اس کے ہم معنی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

باب نمبر:5

فتور (سستی وکاہلی) کا ذکر حدیث کی روشنی میں

(1) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک رسی دیکھی جو دوستونوں کے درمیان باندھی ہوئی تھی، دریافت فرمایا: یہ رسی کیسی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ زینب کی رسی ہے، جوانہوں نے اس لیے باندھ رکھی ہے، جب سستی طاری ہوتی ہے تو اس کے ساتھ لٹک جاتی ہیں (تاکہ سستی دور ہو اور چست ہو کر عبادت کریں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حلوه، ليصل احدكم نشاطه، فاذا فتر فليرقد

اسے کھول دو، تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ چستی اور نشاط کے ساتھ نماز پڑھے، جب سستی طاری ہو جائے تو لیٹ جائے۔(صحيح البخاری: كتاب التهجد)

ٹھہراؤ سنت کے مطابق ہونا چاہیے

(2): حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر چیز کے لیے تیزی و پھرتی اور چستی ہوا کرتی ہے اور ہر تیزی و پھرتی کے لیے سستی ہوا کرتی ہے، (پھرتی و چستی کے بعد سستی طاری ہوتی ہے)۔

یہ حدیث مختلف الفاظ اور مختلف طرق سے مروی ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک آزاد کردہ باندی تھی، جو کہ دن کو روزے رکھا کرتی اور رات بھر تہجد پڑھا کرتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ دن کو روزے رکھتی ہے اور راتوں کو جاگ کر تہجد

پڑھتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان لکل عمل شرة، والشرة الی فترة، فمن کانت فترته الی سنتی فقد اھتدی، ومن کانت فترته الی غیر ذلك فقد ضل وفی روایة فقد ھلك (مجمع الزوائد، و مسند بزار)

ترجمہ: ''ہر عمل میں تیزی اور چستی ہوتی ہے اور چستی و تیزی کے بعد سستی طاری ہوتی ہے، پس جس کا ٹھہراؤ میری سنت کے مطابق ہو تو اس نے ہدایت پالی اور جس کی سستی وٹھہراؤ اس کے علاوہ کسی اور طریقے پر ہو وہ گمراہ ہوا، ایک روایت میں ہے کہ ہلاک ہوا۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا، جو عبادت میں بہت ہی زیادہ محنت کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ اسلام کی ضرورت اور اس کی تیزی و پھرتی ہے، اور ہر عمل میں تیزی و پھرتی ہوا کرتی ہے، اور جس کی سستی وٹھہراؤ اعتدال کے مطابق ہو تو بہت اچھی بات ہے، لیکن جس کی سستی اسے گناہوں کی طرف لے جائے تو ایسے لوگ ہلاک ہونے والے ہیں۔'' (طبرانی)

استطاعت کے بقدر عبادت ضروری ہے

(3) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئے اور ان کے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ خاتون کون ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ فلاں خاتون ہے، اس کی نماز کا ذکر کیا (کہ یہ ایسی عبادت گزار خاتون ہے) تو آپ

نے فرمایا کہ بس کرو، تم لوگوں پر اتنی ہی عبادت کرنا لازم ہے، جتنی کہ تم استطاعت رکھتے ہو، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اجر وثواب دیتے نہیں تھکے گا۔

یہاں تک کہ تم خود تھک کے بیٹھ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کو وہ عبادت پسند ہے جس پر انسان ثابت قدم رہے اور ہمیشہ کرتا رہے، (چاہے تھوڑا عمل ہی کیوں نہ ہو لیکن مداومت اختیار کرنی چاہیے) (صحیح البخاری، کتاب الایمان و مسلم کتاب صلاۃ المسافرین)

عبادت تھوڑی ہو مگر ہمیشہ ہو

(4) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یا عبد اللہ لا تکن مثل فلان، کان یقوم اللیل فترکہ

ترجمہ: ''اے عبداللہ! تم فلاں آدمی کی طرح مت بنو کہ وہ راتوں کو جاگ کر عبادت کیا کرتا تھا، پھر چھوڑ دیا۔ (صحیح البخاری، کتاب التہجد، مسلم کتاب الصیام)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سستی و کاہلی سے پناہ مانگتے تھے

(5) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سستی و کاہلی سے پناہ مانگتے ہوئے فرماتے تھے:

اللھم انی اعوذ بك من الکسل و الھرم و المأثم و المغرم

ترجمہ: ''اے اللہ! میں سستی سے، زیادہ بڑھاپے سے، گناہ میں مبتلا ہونے اور قرض دار ہونے سے تیری مانگتا ہوں۔''

(صحیح البخاری کتاب الدعوات، صحیح مسلم کتاب الذکر)

سستی و کاہلی سے بچنے کا نبوی ﷺ نسخہ

(6) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بار ہا سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

اللهم انى اعوذبك من الهرم و الحزن، والعجز، والكسل، والبخل، و الجبن، غلبة الدين، و قهر الرجال

ترجمہ: ''اے اللہ! میں زیادہ بوڑھے ہونے سے، غمگین ہونے سے، عاجزی سے، سستی سے، بخل سے، بزدلی سے، قرضے تلے دبنے سے اور لوگوں کے غضب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (صحیح البخاری، کتاب الجہاد)

اس حوالے سے احادیث بہت زیادہ بھی ہیں اور مشہور بھی ہیں۔

باب نمبر: 6

فتور (سستی وکاہلی) کاذکر علماء کے اقوال کی روشنی میں

احادیث مقدسہ کے علاوہ بعض علمائے کرام کے اقوال بھی اس موضوع سے متعلق منقول ہیں، جن میں سے کچھ اہم اقوال کو ہم اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض وفات میں روتے ہوئے فرمایا کہ یہ بیماری مجھے سستی وکمزوری کی حالت میں لاحق ہوگی اور چستی وقوت کی حالت میں نہیں آئی۔

نفلی عبادت میں نیند آئے تو سونا بہتر ہے

آپ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ رات پر غالب آنے کی کوشش مت کرو کہ نیند آرہی ہو، پھر بھی عبادت میں لگے رہو، نہیں بلکہ جس کو نیند آئے وہ جا کر سوجائے، یہی اس کے لیے بہتر ہے۔ (مجمع الزوائد، 260/2)

عبادت میں میانہ روی، نشاط اور چستی ملحوظ نظر رکھنا چاہیے

امام نووی رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے ہمیں عبادت میں میانہ روی کا درس ملتا ہے اور اس میں وقتی طور پر زیادہ جوش دکھانے سے منع کیا گیا ہے اور یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ عبادت ایسے وقت میں کرنی چاہیے جب نشاط اور چستی ہو، جب نشاط نہ رہے اور سستی چھا جائے تو انسان کو آرام کرنا چاہیے، یہاں کہ سستی ختم نہ ہو۔ (شرح مسلم للنووی۔2/73)

عبادت میں چستی اور نشاط کی طرف لوٹنے کا طریقہ

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ نے اللہ کے نیک بندوں اور عبادت گزاروں کو سستی و کاہلی کا شکار ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے، سستی تو ہر انسان کو لاحق ہوتی ہے، لیکن جس نے سستی کو کنٹرول میں رکھا اور اس کی وجہ سے عبادات میں کوتاہی نہیں کی، کسی فرض و واجب کو نہیں چھوڑا یا کسی حرام و مکروہ میں مبتلا نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ پھر اچھی حالت یعنی چستی و نشاط کی طرف لوٹے گا۔

باب نمبر: 7

سستی کی علامات

واضح رہے کہ سستی کی کچھ علامات ہیں جن کے پائے جانے کی صورت میں ہم سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کے اعصاب پر سستی طاری ہوگئی، ان میں سے بعض علامات کو وہ شخص خود بھی سمجھتا ہے جس پر یہ طاری ہوتی ہے اور بعض علامات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انہیں وہ سمجھ نہیں پاتا اور ایک شخص کے اندر بسا اوقات ایک سے زیادہ علامات بھی جمع ہوسکتی ہیں اور کبھی ایک ہی علامت بھی ہوسکتی ہے۔

بہر حال یہ علامات اپنے مضر اور خطرناک ہونے کے اعتبار سے مختلف ہیں، کچھ زیادہ خطرناک ہیں اور کچھ کم۔

سستی کی کچھ بڑی علامات درج ذیل ہیں:

سستی وکاہلی کی پہلی علامت

(1) عبادات وطاعات میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرنا، عبادات کی ادائیگی کے دوران بھی بوجھ محسوس کرے، ان عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، اللہ تعالیٰ نے منافقین کی سستی کے حوالے سے بھی نماز کو بطور خاص ذکر کیا ہے، ویسے تو منافقین ہر عبادت میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن نماز ہی کا ذکر اس کی اہمیت کی وجہ سے کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا

ترجمہ: ''یہ منافق لوگ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔'' (سورۃ النساء:142)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ

ترجمہ: ''اور یہ نماز میں آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور (کسی نیکی میں) خرچ کرتے ہیں تو برا مانتے ہوئے خرچ کرتے ہیں۔'' (سورۃ التوبۃ: 54)

اس سستی میں تہجد یا وتر کی نماز کے لیے نہ اٹھنا، سنت نمازوں کو چھوڑنا، یا ان کا زیادہ نہ کرنا بھی شامل ہے۔ اسی طرح اس سستی کا شکار شخص قرآن کریم کی تلاوت اور ذکرواذکار کی پابندی میں غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔ ان عبادات میں وہ بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چھوڑ ہی دیتا ہے۔

سستی وکاہلی کی دوسری علامت

(2) سستی وغفلت یا کاہلی کی دوسری علامت یہ ہے کہ انسان کے دل میں سختی کے آثار نمودار ہونے لگ جائیں، جس کے بعد وہ قرآن کریم کی آیات، وعظ ونصیحت کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا، گناہوں کی کثرت کی وجہ سے اس پر زنگ لگ جاتا ہے، اس زنگ کے ہوتے ہوئے دل پر کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ اسی بارے میں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (سورة المطففين: 14)

ترجمہ: ''ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں، اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔''

اس قسم کے لوگوں کے دل تقریباً یہودیوں کے دلوں کی طرح ہو جاتے ہیں، جن کے بارے میں رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً

ترجمہ: ''اور اس سب کے بعد تمہارے دل پھر سخت ہو گئے، یہاں تک کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر! بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی زیادہ۔'' (سورة البقرة: 74)

دل کی اس سختی کا اثر یہ ہوگا کہ وہ کسی کے مرنے پر یا کسی مردے کو دیکھ کو ذرہ بھی متاثر نہیں ہوگا، وہ قبرستانوں میں جائے گا، قبروں کو دیکھے گا، لیکن اس سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، حالانکہ انسان کو عبرت حاصل کرنے کے لیے موت ہی کافی ہے۔

جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

موت یا مردوں سے عبرت یا نصیحت حاصل کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ان واضح آیات سے بھی ذرہ برابر متاثر نہیں ہوگا، جو اس کے سامنے پڑھی جائیں گی، ان آیات میں وہ نیک اعمال پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت کے وعدوں اور بداعمال پر جہنم کی وعیدوں کو سنے گا، لیکن ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دے گا، اس کے دل میں ذرہ بھی نرمی یا خوف خدا یا خشوع وخضوع پیدا نہیں ہوگا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (سورة ق:45)

ترجمہ: ''لہٰذا قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرتے رہو جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔''

دوسرے مقام پر مومنین کی مدح وتعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

ترجمہ: ''مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔'' (سورة الانفال:2)

سستی وکاہلی کی تیسری علامت

(3) سستی وکاہلی کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان کو گناہوں میں لذت اور رغبت محسوس ہونے لگ جائے اور بعض گناہوں پر وہ اصرار بھی کرنے لگ جائے یعنی ان کا عادی ہو جائے اور اس کے باوجود اس کو یہ احساس نہ ہو کہ یہ طرز عمل کتنا خطرناک ہے اور میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کے میرے حق میں کیا نتائج نکلیں گے۔

بس وہ اپنی بے حسی کی وجہ سے ہر گناہ کے بارے میں یہی کہہ کر اس کا ارتکاب کرتا رہتا ہے کہ یہ تو صغیرہ یعنی چھوٹا گناہ ہے۔

بس اپنے آپ کو اس طرح جھوٹی تسلیاں دے کر گناہ کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا شمار فاسق مجاہر یعنی کھلم کھلا گناہ کرنے والوں میں ہوتا ہے اور اس پر کسی

گناہ کا مشکل نہیں ہوتا، سب کے سامنے کھلے عام ہر طرح کے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ بات بہت خطرناک ہے۔

اس لیے کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

كل امتي معافى الا المجاهرين (بخاری، کتاب الادب)

ترجمہ: ''میرے ہر امتی کی بخشش ہوگی، سوائے کھلم کھلا گناہ کرنے والے''

کیونکہ ایسا شخص خود تو گناہ کرتا ہی کرتا ہے اور کھلم کھلا کرنے کی وجہ سے گویا وہ دوسروں کو بھی گناہ کے کاموں کی طرح بلاتا اور دعوت دیتا ہے، اس لیے اس پر شدید وعید آئی ہے۔

سستی و کاہلی کی چوتھی علامت

(4) سستی و کاہلی اور بے حسی کی ایک بڑی علامت یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہو اور اسے یہ پرواہ ہی نہ ہو کہ مجھ پر کتنی بڑی ذمہ داری اور مسئولیت کا بوجھ ہے اور یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی بڑی امانت ہے، چاہے وہ ذمہ داری کسی حوالے سے بھی ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

ترجمہ: ''ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھالیا، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے۔'' (سورۃ الاحزاب: 72)

انسان اپنی غفلت اور بے حسی یا سستی و کاہلی کی وجہ سے کبھی یہ سوچتا ہی نہیں کہ میں کون ہوں، میری کیا ذمہ داری ہے، مجھے کس لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے، اگر کبھی کبھا سوچتا بھی ہے تو پھر بھی اس پر کوئی عملی اقدام نہیں کرتا اور فوراً دوسرے تفکرات میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی نہیں آتا کہ مجھے دعوت کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے، اس کے لیے کبھی اس کی پلکیں تر نہیں ہوتیں اور خود کو بستر سے جدا نہیں کرتا۔

اس قسم کا بے حس اور سست انسان بغیر کسی ہدف و مقصد کے جانوروں کی طرح زندگی گزارتا ہے، اس کے سامنے چونکہ کوئی اہم اور عالی مقصد یا ٹارگٹ نہیں ہوتا، اس لیے وہ کسی عمل کا اہتمام بھی نہیں کرسکتا، یوں سستی و غفلت میں زندگی کے ایام بیت جاتے ہیں۔

سستی و بے حسی کی وجہ سے اسے مسلمانوں کے اجتماعی امور کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی اور ان مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مصائب سے وہ غمگین نہیں ہوگا اور نہ کسی اہم معاملے میں ان کی مدد کرسکے گا، اگر وقتی طور پر اس کے دل میں مسلمانوں سے ہمدردی کا کوئی جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو بے حسی کی وجہ سے بہت جلد وہ بھی ماند پڑ جائے گا۔

سستی و کاہلی کی پانچویں علامت

(5) سستی و بے حسی کی ایک اور بدترین علامت یہ ہے کہ دو دوستوں اور دینی بھائیوں کے درمیان بھائی بندی کا رشتہ ٹوٹ جائے اور آپس کا تعلق کمزور پڑ جائے، بلکہ یہ معاملہ اس سے آگے نکل کر دونوں میں محبت و تعلق کے بجائے نفرت و وحشت کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

پھر ایک دوسرے کے قریب آنے کے دور سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے دنیوی واخروی نقصانات کا انہیں انہیں ذرہ بھی احساس نہیں ہوتا، یہ بے حسی ہی کے سبب ایسا ہوتا ہے۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''جب دو شخص آپس میں اللہ تعالیٰ کے لیے یا اسلام کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے تو وہ کسی ایک کے گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے، یعنی جو جدائی کا سبب بنتا ہے گناہ گار وہی ہوگا۔'' (مسند احمد)

کسی سے دین کی خاطر دوستی ومحبت کرنے کے بعد بے حسی وسستی کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو اس سے دور کرے گا، اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے دوستی ومحبت کرنا بہت بڑی نیکی اور ایمان کی علامت ہے، اس کے باوجود جو شخص اس تعلق کو کمزور کرتا ہے، وہ بے حس اور سست وکاہل ہی تو ہے کہ اتنا بڑا اجر وثواب والا عمل اس کے ہاتھوں سے نکل رہا ہے اور اسے احساس تک نہیں۔

اس آدمی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اس دوست سے جدائی چاہے گا، یا کسی لالچ اور مقصد کے لیے اس سے دوستی کرے، یا دوستی کا کوئی عوض چاہے گا، جس کے بعد وہ نہایت ہی معمولی چیز کے عوض اپنا بہت بڑا اجر وثواب گنوا بیٹھے گا، اگر اس نیک صالح دوست کی کہیں اس سے ملاقات ہو جائے تو یہ ملاقات اس کو ناگوار گزرے گی۔

کسی محفل میں ساتھ بیٹھے ہوں تو اس کے لمحات اس شخص پر بہت گران گزریں گے، اگر اسے بھاگنے کا موقع ملے تو یہ راہ فرار اختیار کر جائے اور ایسا کرنا اس کے لیے کوئی بعید بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے: اے دلوں کو پلٹنے والے! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم

رکھ اور ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جو تیری ذات پاک کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں تیرا یہ ارشاد ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ

ترجمہ: ''اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے متقی لوگوں کے۔'' (سورة الزخرف: 67)

سستی وکاہلی کی چھٹی علامت

(6) دنیا کی زندگی میں منہمک اور مستغرق ہونا، انسان دنیا ہی کے ساتھ مشغول جائے، اللہ کی عبادت، اللہ کے دین کی طرف دعوت، دین کے علم کا حصول وغیرہ تمام دینی مشاغل کو یکسر چھوڑ کر دنیا ہی میں مشغول ہو جائے، دنیا ایک میٹھا زہر ہے، ظاہری طور پر دنیا اتنی خوبصورت ہے، کہ جو ایک بار اس میں گھس گیا وہ پھنس جائے گا، بہت سے ایسے لوگوں کو بھی ہم جانتے ہیں۔

جو دین کے داعی یا طالب علم یا عالم تھے، لیکن پھر دنیا میں ایسے گھس گئے کہ سب کچھ لٹا دیئے، کچھ نہیں رہا، دل دنیا کو دے بیٹھے، اب دنیا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، دنیا ہی کے لیے مرتے اور جیتے ہیں اور دنیا ہی ان کی منزلِ مقصود اور زندگی کا ہدف بنی ہوئی ہے، دنیا کے حوالے سے بخل وکنجوسی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورة الحشر: 9)

ترجمہ: ''اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

سستی وکاہلی کی ساتویں علامت

(7) بے حسی و سستی کی ایک اور علامت یہ ہے کہ انسان باتیں تو بہت کرے، لیکن کوئی ایسا عمل یا کام نہ کرے جس سے امت مسلمہ یا نئی نسل کو کوئی فائدہ ہو، اس قسم کے لوگ اپنی سابقہ زندگی کے کارناموں کو گنتے رہتے ہیں، کہ جناب، ہم نے یہ کام کیا ہے، ہم ایسے تھے، ہم ویسے تھے اور میں میں کی گردان دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی باتوں پر تکیہ کر کے وہ کوئی مفید کام نہیں کر سکتے، ان کا قول عمل کی نفی کرتا ہے، قول وعمل میں تضاد ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد پاک ہے:

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورۃ الصف: 3،2)

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابل نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔‘‘

اس قسم کے لوگ بحث ومباحثہ میں ماہر ہوتے ہیں، ہر ایک سے فضول باتوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور یہی لوگ رسول کریم ﷺ کے اس فرمان عالی شان کے مصداق ہیں:

ما ضل قوم بعد هدى الا اوتوا الجدل (ترمذی، کتاب التفسیر)

ترجمہ: ’’ہدایت ملنے کے بعد کوئی قوم اس وقت گمراہ ہوتی ہے، جب وہ لڑایا جائے۔‘‘

سستی وکاہلی کی آٹھویں علامت

(8) بے حسی وسستی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے نفس اور ذات کے لیے غیر معمولی اہتمام کرنے لگ جائے، ہر قسم کی مرغن اور لذیذ غذائیں، اعلیٰ کوالٹی کی سواری، عمدہ مشروبات، نفیس کپڑے اور پر تعیش رہائش گاہ وغیرہ اس قسم کی چیزوں کا اہتمام کیا کرے، ان چیزوں کے پیچھے ایسا لگ جائے کہ شریعت کی مقرر کردہ حدود کو بھی پار کر جائے، اللہ تعالیٰ نے جائز حد تک دنیوی لذتوں سے مستفید ہونے کی اجازت دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

ترجمہ: ”اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! جب کبھی مسجد میں آؤ تو اپنی خوشنمائی کا سامان کرو (یعنی لباس جسم پر) لے کر آؤ اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی مت کرو، یاد رکھو اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔“ (سورۃ الاعراف:31)

کھانے پینے کی چیزوں سمیت تمام ضروریات زندگی کا اہتمام اور لذات دنیوی سے مستفید ہونا جائے، لیکن اپنا پورا وقت اسی مقصد کے لیے صرف کرنا اور تمام تر امور پر انہی کو فوقیت واہمیت دینا، اپنا مال اسی کے لیے خرچ کرنا اور انہی چیزوں کو اپنا مطمع نظر بنانا بہرحال غفلت، بے حسی اور سستی وکاہلی کی ایک علامت ہے۔

سستی وکاہلی کی نویں علامت

(9) غیر وحمیت کی چنگاری کا بجھ جانا بھی سستی وکاہلی اور بے حسی وغفلت کی علامت ہے، یہ تو ایمان کی کمزوری ہے کہ انسان کو مناسب موقع محل پر غصہ نہ آئے، مثلاً اللہ کی حدود پامال کی جائیں اوراس کی نافرمانی عام ہوجائے اورانسان کے ماتھے پر کوئی شکن نہ آئے۔

تباہ کن چیزوں کو دیکھ کر انسان لمبی چادر سو جائے جیسا کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے، کوئی عملی کام کرنے کے بجائے صرف انا اللہ یا لا حول و لا قوۃ الا باللہ پڑھنے پر ہی اکتفا کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر غیرت ایمانی نہیں ہے اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ ٹھیک ہے غصہ شیطان کی طرف سے ہے، لیکن دین یا اپنی عزت کے معاملے میں غصہ آنا عین ایمان کا تقاضا ہے اور جسے غصہ نہیں آتا تو یہ اس کی بے حسی، سستی وکاہلی اور غفلت کی نشانی ہے۔

سستی وکاہلی کی دسویں علامت

(10): بے حسی وسستی علامات کے بیان کا اختتام میں ہم کچھ تفصیل کے ساتھ چند باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں، امید ہے کہ قارئین ان اہم باتوں پر غور فرمائیں گے، یہ چیزیں آج کل بالکل عام ہوگئی ہیں، تقریباً ہر قسم کے سست و بے حس لوگوں میں پائی جاتی ہیں، اس اہمیت کے پیش کے نظر ہم نے ان کو آخر میں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وقت کا ضیاع ایک مہلک بیماری کی مانند ہے

(الف) وقت کا ضیاع اور اس سے فائدہ نہ اٹھانا اور ایسے فضول کاموں میں وقت صرف کرنا جن کا کوئی دنیوی یا اخروی کوئی فائدہ نہ ہو، یا اہم کاموں کو چھوڑ کر غیر اہم کاموں پر وقت ضائع کرنا، یہ آج کل ایک عام سی بیماری بن گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان کے وقت سے برکت بھی اٹھ جاتی ہے۔

کئی دن گزرنے کے باوجود انسان یہ نہیں بتلا سکتا کہ اس نے ان دنوں میں کیا کام کیا اور کتنا فائدہ کمایا، تو سست و کاہل اور بے حس لوگوں میں یہ بیماری عام ہے اور یہ ان کی ایک علامت بھی ہے۔

خود اعتمادی کا فقدان بھی زہر قاتل ہے

(ب) کسی چیز کے اہتمام اور التزام کی صلاحیت کا نہ ہونا اور ہر اہم و مفید کام سے راہ فرار اختیار کرنا تاکہ کہیں اسے واپس ذمہ داری اٹھا کر کام نہ کرنا پڑے اور اس نے ویسے بھی ہمت ہاری ہوئی ہے، اس لیے کسی کام کا اہتمام ہی نہیں کرتا، اس لیے کہ اہتمام کے بعد تو اسے کرنا پڑے گا، اسی طرح شیطان اس شخص کو دھوکہ دے کر سستی و کاہلی اور کم ہمتی کو اس کے لیے مزین بناتا ہے اور یہ اس پر خوش ہے۔

پوری زندگی بے ڈھنگ گذر جانے کی وجہ

(ج) اپنے امور کے لیے کوئی ٹائم ٹیبل اور پیشگی ترتیب مقرر نہ کرنا، اس سے آدمی کسی مقصد و ہدف یا ٹارگٹ مقرر کیئے بنا کوئی کام کرتا ہے اور اس کا کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہوتا، چونکہ پیشگی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے ہر عمل اچانک ہوتا ہے، ایک

کام شروع کرتا ہے اسے پایہ تکمیل کو پہنچائے بغیر دوسرے کام میں لگ جاتا ہے اور پھ
اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی تیسرے کام میں لگ جاتا ہے، یوں اس کے تمام امو
ادھورا اور بے ترتیب رہتے ہیں اور پوری زندگی بے ڈھنگ گزر جاتی ہے۔

نفس کا دھوکہ

(د) بہت سے لوگوں کو ان کا نفس اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ آپ بہت
مصروف ہیں، حالانکہ وہ بالکل فارغ ہوتے ہیں یا وہ مشغول ہوں بھی تو نفس دھو
سے کسی ایسے کام میں لگا دیتا ہے، جس کی قرآن وسنت کی روشنی میں کوئی اہمیت نہیں
ہوتی اور نفس انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ یہ بہت بڑا عمل ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس
ہوتی ہے، ایسے لوگ بھی درحقیقت بے حس و کاہل ہوتے ہیں۔

ہر اچھے اور مثبت عمل پر اعتراض وتنقید کرنا

(ھ) ہر مثبت عمل اور سرگرمی پر تنقید کرنا، کہ کسی اس میں شرکت نہ کر
پڑ جائے، اور اپنے آپ کو اس میں شرکت سے معذور ثابت کرنے کے لیے بہا
تراشنا اور اعذار بنانا اور راہ فرار اختیار کرنے کے لیے قسم قسم کے اسباب اور بہا
تراشنا، یہ بھی بے حسی، سستی و کاہلی کی علامت ہے، جیسے کہ منافقین کے بارے میں ا
تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ
نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (سورۃ التوبۃ:81)

ترجمہ: ''جن لوگوں کو (غزوۂ تبوک سے) پیچھے رہنے دیا گیا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کے جانے کے بعد اپنے (گھروں میں) بیٹھے رہنے سے بڑے خوش ہوئے اور ان کو یہ بات ناگوار تھی کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان سے جہاد کریں اور انہوں نے کہا تھا کہ: ''اس گرمی میں نہ نکلو!'' کہہ کہ: ''جہنم کی آگ گرمی میں کہیں زیادہ سخت ہے!'' کاش! ان لوگوں کو سمجھ ہوتی۔''

منصوبوں پر منصوبے بنانا بھی سستی وکاہلی کی علامت ہے

(و) اہم اور ضروری امور کو عملی جامہ پہنانے میں جان بوجھ کر تاخیری حربے استعمال کرنا اور آج کے کام کو کل پر ٹالتے رہنا، پھر عملی طور پر کوئی کام کئے بنا صرف ذہنی پلاؤ پکانا کہ میں یہ کروں گا، وہ کروں گا اور اپنے ذہن میں منصوبوں پر منصوبے بنانا بھی بے حسی اور سستی وکاہلی کی علامت ہے، ایسا شخص کسی کام کی ابتدا تو نہیں کرسکتا، منصوبوں پر ہی کئی ہفتے اور بسا اوقات سال گزر جاتے ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کی بے حسی وسستی وکاہلی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

باب نمبر: 8

سستی و کاہلی اور بے حسی کے اسباب و وجوہات

سستی و بے حسی کے کئی اسباب ہیں، جن کی مختلف و متنوع اقسام ہیں، اگر مسلمان ایک سبب سے بچ جائے تو دوسرے اسباب سے بچنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے، ان اسباب میں سے بعض تو عام ہیں اور بعض خاص ہیں۔ یعنی بعض اسباب عبادات، طلب علم اور دین کی دعوت کے حوالے سے رکاوٹ بنتے ہیں اور بعض اسباب کچھ دیگر امور کی انجام دہی سے مانع بنتے ہیں۔

اس مختصر رسالے میں ہم زیادہ توجہ انہی اسباب کے بیان پر دیں گے جو دین کی دعوت کے حوالے سے انسان کو سستی و کاہلی یا بے حسی کا شکار کرتے ہیں، پھر ان اسباب پر بھی روشنی ڈالیں گے جو انسان کو عبادات اور طلب علم کے میدان میں سستی و کاہلی سے دوچار کرتے ہیں۔

پھر بعض اسباب کے بیان میں ہم اختصار کے ساتھ ان کے علاج کے طریقہ کار کی بھی وضاحت کریں گے، اگرچہ علاج کا بیان مستقل الگ فصل میں آ گے گا، اسباب کے بیان کے ساتھ علاج کا بیان کرنا اس لیے ضروری ہے، کہ اس سے علاج کرنا بھی آسان ہوتا ہے اور ہر سبب کا علاج کارگر بھی ہوتا ہے۔

(1) اخلاص کا نہ ہونا

سستی و بے حسی کا سبب سے بڑا سبب اخلاص کا نہ ہونا ہے، اخلاص کسی بھی عمل کی قبولیت کے لیے بنیادی شرط ہے، اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول فرماتا ہے، جس میں اخلاص ہو اور وہ عمل شریعت کے بتائے ہوئے درست طریقے پر کیا گیا ہو، ورنہ کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (سورة البينة : 5)

ترجمہ: ''اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی بالکل یکسو ہو کر صرف اسی کے لیے خالص رکھیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (سورة الزمر: 3)

ترجمہ: ''یاد رکھو کہ خالص بندگی اللہ ہی کا حق ہے۔''

اخلاص کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (سورة الزمر: 11)

ترجمہ: ''کہہ دو کہ: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ میری بندگی خالص اسی کے لیے ہو۔''

اس کے علاوہ بھی اخلاص کی اہمیت پر دلالت کرنے والی آیات بہت زیادہ ہیں۔ بے شمار احادیث مبارکہ میں بھی اخلاص کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ مشرک سے بیزار ہے

چنانچہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے:

انا اغنى الشركاء عن الشرك من عمل عملا اشرك فيه معى غيرى تركته و شركه (مسلم كتاب الزهد)

ترجمہ: ''میں شرک کرنے والوں کو شرک سے مستغنی کر دیتا ہوں، (میرے ہوتے ہوئے کسی اور کے لیے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے، جب میں کسی عمل پر دس سے سات سو گنا تک اجر دیتا ہوں) جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تو میں اس شخص اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں (اس شخص سے اور اس کے عمل سے میں بیزار ہوں)''

تو جس شخص کے اندر اخلاص ہوگا، وہ اسے اعمال میں محنت کرنے پر ابھارے گا، اخلاص والا شخص کسی نیک عمل میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا، اس لیے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس عمل کے بدلے میں اللہ تعالیٰ مجھے بہت بڑا اجر وثواب مرحمت فرمائے گا اور مخلص شخص سستی کی وجہ سے گناہ کا مرتکب بھی نہیں ہوگا، کیونکہ اسے ڈر ہوتا ہے کہ گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے سزا سے دوچار کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (سورة الكهف: 110)

ترجمہ: ''لہٰذا جس کو اپنے مالک سے ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔''

لیکن اگر خدانخواستہ اخلاص میں کمی ہو، یا انسان ریا کے مرض میں مبتلا ہو تو بہت جلد اعمال کرنے میں وہ سستی کا شکار ہو جائے گا اور اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔

پھر اخلاص کے حوالے سے انسان کی کئی حالتیں ہیں، جن میں سے زیادہ اہم دو حالتیں ہیں، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے:

پہلی حالت

(الف): پہلی حالت یہ ہے کہ انسان کا اصل عمل ہی اخلاص سے بالکل ہی خالی ہوگا، جیسے کہ کسی شاعر نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے:

صلى المصلي لأمر كان يطلبه فلما انقضى الأمر لا صلى و لا صام

ترجمہ: ”(فلاں) نمازی کسی خاص مقصد کے لیے نماز پڑھتا تھا، جب وہ مقصد پورا ہو گیا تو اب نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ ہی روزہ رکھتا ہے۔“

دوسری حالت

(ب) دوسری حالت یہ ہے کہ انسان کے اصل عمل میں تو اخلاص ہوگا، لیکن کچھ خارجی اسباب کی وجہ سے اخلاص کمزور ہو جائے گا، خارجی اسباب جیسے ریا، دکھلاوا، حب جاہ، دنیا طلبی یا کوئی ایسی دنیوی غرض عمل کے ساتھ مل جائے، جس سے عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے نہ رہے، جب عمل میں اخلاص بالکل نہ رہے تو وہ بے فائدہ و ضائع ہو جائے گا اور اگر اخلاص کمزور ہو جائے تو اس کا اجر و ثواب کم ہو جائے گا۔

اس لیے نیکی کا کوئی عمل کرتے ہوئے مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اپنے اخلاص کا بڑا خیال رکھے اور بار بار اس کی تجدید کرتا رہے، تاکہ اس کا عمل ضائع نہ ہو اور پورا اجر و ثواب کا مستحق ہو جائے۔

(2) شرعی علم کی کمی یعنی جہالت

سستی و کاہلی اور بے حسی کا ایک اور بڑا سبب جہالت ہے، جہالت ایک زہر قاتل اور مہلک بیماری ہے۔ چونکہ جاہل انسان کو اپنی مہلک بیماری کی ہلاکت خیزی کا اندازہ ہی نہیں ہوتا، اس وجہ سے اس بیماری کی ہولناکی اور بڑھ جاتی ہے، اس لیے کہ انسان اس بیماری کا علاج کراتا ہے جس کا اسے علم ہو، لیکن جہالت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

جس مسلمان کے پاس شریعت کے علم کی کمی ہو تو وہ بہت جلد سستی و کاہلی اور بے حسی کی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس کو ان شرعی دلائل کا علم نہیں ہوتا، جو انسان کو طلب علم اور دین کی دعوت، عبادات اور اعمال پر ابھارتے ہیں اور بے علم انسان نہ ان فضائل سے واقف ہوتا ہے جو کسی نیک عمل کے کرنے پر انسان کو ملتے ہیں اور نہ ہی ان وعیدات وسزاؤں کا اسے علم ہوتا ہے جو کسی گناہ کے کرنے یا عبادت کے چھوڑنے پر اسے ملتی ہیں۔

اس لیے وہ سست پڑ جاتا ہے اور کسی عمل پر ثابت قدمی نہیں دکھا سکتا، گناہ کے چھوڑنے پر اور نیکی کے کرنے پر صبر نہیں کر سکتا، کیونکہ اسے صبر کا اجر وثواب جہالت کی وجہ سے معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کسی عمل پر تھوڑی بہت تکلیف ہو تو اس پر شکوہ شکایت کرتا پھرے گا اور بالآخر عمل کرنا ہی چھوڑ دے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کرنے سے جہالت کا نقصان اور علم کے فوائد ظاہر ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ (سورۃ الزمر:9)

ترجمہ: ''کہو کہ: ''کیا وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ (مگر) نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُ (سورۃ فاطر: 28)

ترجمہ: ''اللہ کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں جتنی علم کی فضیلت ہے اور اتنی ہی جہالت مذموم ہے، اس لئے ہم نے اسے ایک بیماری قرار دیا ہے اور بیماری کا فوری علاج ہونا چاہیے۔ علاج کا بیان آگے آئے گا۔

(3) دل کا دنیا کی محبت میں گرفتار ہوکر آخرت کو بھول جانا

سستی و کاہلی اور بے حسی کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کی محبت میں گرفتار ہوکر آخرت کو بھول جائے اور ہر معاملے میں دنیوی مفاد کو اخری مفاد پر ترجیح دے، جس کے بعد آہستہ آہستہ اس کا ایمان کمزور ہوتا چلا جائے گا، ایمان کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عبادات بھاری محسوس ہوں گی اور لذت سے خالی ہوں گی، لذت و مزہ صرف دنیوی چیزوں میں آئے گا۔

یہاں تک کہ انسان آخرت کو بالکل ہی بھول جائے اور تمام لذات کو ختم کرنے والی چیز (موت) سے بھی غافل ہوجائے گا اور دنیا سے اتنی لمبی امیدیں وابستہ کرے گا، گویا کہ ہمیشہ اسے اس دنیا میں ہی رہنا ہے اور جس شخص کے اندر یہ بلائیں جمع ہوجائیں تو اس کو ہلاک کر کے ہی چھوڑیں گی۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

تعس عبد الدینار تعس عبد الدرھم (صحیح البخاری: کتاب الجھاد)

ترجمہ: ''ہلاک ہوجائے دینار کا بندہ، ہلاک ہوجائے درہم کا بندہ۔''

موجودہ دور میں لوگوں کی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے، عوام تو پھر بھی عوام ہیں، ہم بہت سے ایسے دینی طالب علموں اور علماء کو جانتے ہیں، جو دنیا طلبی میں ایسے منہمک ہوگئے کہ دین سے کوسوں دور چلے گئے، اب ان کا مطمع نظر دنیا اور اس کے مفادات، جاہ وجلال، عہدہ ومنصب اور مال ودولت کا حصول ہوکر رہ گیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کی بات ہے جس کی وضاحت کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ بعض علماء

اور دین کے داعی یا طالب علم صرف اس لیے کسی دنیوی کام میں مشغول ہوتے ہیں تا کہ اس سے کچھ کما سکیں تا کہ ان کا گزر بسر اچھی طرح ہو اور وہ کسی کا محتاج نہ ہوں، لیکن ان دنیوی مشاغل کے باوجود وہ اپنے دینی فرائض کو بحسن وخوبی سرانجام دیتے ہیں اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے، اسی طرح وہ دنیوی مشاغل کے باوجود دنیا کے اسیر بھی نہیں ہوتے۔

یہ امر بہت ہی ممدوح اور قابل ستائش ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کے خطرات بہت زیادہ ہیں، ان کا دنیوی مشاغل میں گرفتار ہو کر دنیا پرست ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں، دنیوی مفادات ان کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ مستقل انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ساتھ شیطان ملعون کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے اور وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے تا کہ ان لوگوں کے دل میں دنیا کی محبت پیدا کر سکے، وہ انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دین کا کام کرتے ہیں، انہیں دنیا سے کوئی خطرہ نہیں۔

لیکن اس کے ساتھ وہ دنیا کی محبت کا انجکشن ان کے اعصاب میں اتارتا رہتا ہے، جس کے بعد لاشعوری طور پر وہ دنیا کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اپنے دینی کاموں سے بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اس لیے علماء و طلبہ اور دین کی دعوت کا عظیم کام سرانجام دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا کو بقدر کفاف یعنی بقدر ضرورت ہی اپنائیں، اس میں زیادہ گھسنے سے پرہیز کریں، جیسے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

انما یکفی احدکم ما کان فی الدنیا مثل زاد الراکب

ترجمہ: ''تم میں سے ہر ایک شخص کے لیے دنیا میں سے اتنا ہی کافی ہے جتنا کہ کسی سواری کے لیے اس کا توشہ، یعنی سوار اپنے ساتھ سفر میں زیادہ بوجھ نہیں لے جاسکتا، بلکہ وہ اتنا ہی سامان اپنے ساتھ لے جاتا ہے جو اس کے توشے کے لیے کافی ہو۔'' (الترمذی، کتاب اللباس)

یاد رکھیں کہ دنیا بہت سرسبز وشاداب اور میٹھی چیز ہے، جیسے کہ حدیث پاک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان الدنیا حلوة خضرة (مسلم: کتاب الذکر)

ترجمہ: ''بے شک دنیا میٹھی اور سرسبز وشاداب چیز ہے۔''

اونچے عہدوں اور مناصب کے پیچھے لگنے والے اور ان میں ترقی کے لیے کوشش کرنے والے اور صبح شام اسی کے حوالے باتیں کرنے والے لوگ بھی درحقیقت دنیا پرستی کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا دل دنیا کی محبت میں گرفتار رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

من کان یرید ثواب الدنیا فعند الله ثواب الدنیا و الآخرة

ترجمہ: ''جو شخص صرف دنیا کا ثواب چاہتا ہو (اسے یاد رکھنا چاہیے کہ) اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے۔'' (سورة النساء134)

(4) آل واولاد کا فتنہ

سستی و کاہلی اور بے حسی کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب انسان کی آل واولاد اور بیوی بچے بھی ہیں، ان کی وجہ سے انسان اللہ کی یاد اور عبادت سے غافل ہو جاتا ہے، یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتنہ قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

واعلموا انما اموالکم و اولادکم فتنة (سورۃ الانفال: 28)

ترجمہ: ''اور یہ بات سمجھ لو کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (سورۃ التغابن: 14)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔''

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

الولد مخزنة مجبنة مجلة و مبخلة (مستدرك الحاكم)

ترجمہ: ''لڑکا خزانہ بنانے، بزدلی دکھانے، جہالت برتنے اور بخل کرنے کا سبب ہے۔''

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

ان اول فتنة بنی اسرائیل كانت فی النساء (مسلم: کتاب الذکر)

ترجمہ: ''بنی اسرائیل سب سے پہلے عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہوئے۔''

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیوی عبادات، طلب علم اور دعوت دین کے راستے میں معاون ومددگار بن جاتی ہے اور کبھی وہی ان چیزوں سے روکنے والا فتنہ بھی بن سکتی ہے اور یہ ایک ایسا فتنہ ہے جس کی ہولناکی اور نقصانات کا انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو اسے اس کے جمال، مال یا کسی اور وجہ سے اپنے لیے نعمت خداوندی سمجھ رہا ہوتا ہے، لیکن درحقیقت وہ ایک مصیبت ہوتی ہے۔

جو اس کے گھر پر اتر آئی ہے اور وہ اسے مصیبت سمجھتا ہی نہیں ہے، یاد رکھیں تمام بیماریوں میں سب سے خطرناک اور گھٹیا بیماری وہی ہوتی ہے، جو ظاہر نہ ہو اور دشمنوں میں سب سے خطرناک دشمن وہ ہوتا ہے جو دوست کی صورت میں پیش آئے، یعنی بیوی بچے آستین کا سانپ ہے جو انسان کو روحانی طور پر ڈس کر ہلاک کر دیتی ہے اور یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ ہر معاشرے میں اس کی کئی زندہ مثالیں موجود ہیں۔

بیوی کی طرح اولاد بھی انسان کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے، جس کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے انسان بہت سے دینی امور کی انجام دہی میں غفلت وسستی کا مظاہرہ کرتا ہے، اولاد کی پرورش، ان کے مستقبل اور تعلیم وتربیت کی فکر میں گھل جاتا ہے، ان سے جدائی کے غم میں خود کو بھول جاتا ہے، گویا کہ وہ اپنی عمر عزیز کو بیوی اور بچوں کے ساتھ ضائع کر دیتا ہے، اسی لیے اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

ترجمہ: ''لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے، جو ان کی

نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں، یعنی عورتیں، بچے، سونے، چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔'' (سورۃ آل عمران : 14)

یہاں یہ بھی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ بعض لوگوں کی شادی کے بعد عبادات، طلب علم اور دعوت الی اللہ کے معمولات میں کچھ فرق آ جاتا ہے، لوگ اسے بھی سستی و کاہلی یا کمزوری میں شمار کرتے ہیں اور ان کی طرف انگلیاں اٹھا کر ان کی مذمت کرتے ہیں۔

لیکن اس حوالے سے کچھ تفصیل ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس شخص کے معمولات میں جو تبدیلی آئی ہے، وہ اگر حقوق زوجیت یعنی بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی کی وجہ سے ہے اور اس کی وجہ سے وہ دینی حوالے سے کوئی زیادہ کمزوری نہیں دکھا رہا، فرائض و واجبات کو احسن طریقے سے ادا کر رہا ہے، سنتوں کی بھی پابندی کرتا ہے، طلب علم یا دعوت دین میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا تو یہ کوئی قابل مذمت یا بری بات نہیں ہے، کیونکہ ظاہر بات ہے کہ شادی سے پہلے اس کے ذمہ بیوی بچوں کے حقوق نہیں تھے، وہ اس حوالے سے فارغ تھا۔

اب شادی کے بعد اس کے اوپر ایک نئی ذمہ داری آئی ہے، جس کا پورا کرنا اس پر فرض ہے، نئی ذمہ داری کے ہوتے ہوئے وہ پہلے کی طرح تو عبادات یا دینی کام سرانجام نہیں دے سکتا، بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی بھی درحقیقت شریعت ہی کا حکم ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

ان لربك عليك حقا ؑ و ان لنفسك عليك حقا ؑ و لا هلك عليك حقا ؑ فاعط كل ذی حق حقه

ترجمہ: ''بے شک تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے نفس کا بھی تم پر ایک حق ہے، تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر ایک حق ہے، پس ہر ایک حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔'' (صحیح البخاری: کتاب الصوم)

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو کہ خدانخواستہ شادی اور صاحب اولاد ہونے کے بعد وہ گھر پر ہی بیٹھا رہا، بیوی بچوں میں مشغول رہا، اس کی وجہ سے اس کے دینی امور متاثر ہوئے تو یہ بہت خطرے کی بات ہے، بلکہ یہ تو منافقین کی خاصیت ہے، جن کا قول قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے، انہوں نے جہاد پر نہ جانے کے بعد کہا تھا:

شَغَلَتْنَا اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا (سورۃ الفتح:11)

ترجمہ: ''ہمیں ہمارے اموال اور اہل وعیال نے (جہاد میں جانے سے) مشغول کر لیا تھا۔''

اپنے بیوی بچوں کے حوالے سے لوگ بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ لوگ دینی امور کی وجہ سے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں اور کچھ حقوق کی ادائیگی کے بہانے سے دینی امور میں کوتاہی کا مرتکب ہوتے ہیں، لیکن محتاط اور بہترین راستہ درمیانہ ہے کہ ایک کو اس کا حق دیا جائے، کسی کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی اور بخل سے کام نہ لیا جائے اور حق کی ادائیگی میں زیادہ غلو کا مظاہرہ بھی نہ کیا جائے۔

بہر حال بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے انسان کو ذرہ محتاط رہنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتنہ قرار دیا ہے اور فتنہ سے بچنا ذرا مشکل ہوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (سورۃ الانفال: 28)

ترجمہ: ''اور یہ بات سمجھ لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (سورۃ التغابن: 14)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔''

(5) خراب ماحول میں رہنا

ماحول کا انسانی زندگی اور طرز عمل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان ایسے معاشرے اور ماحول میں رہتا ہو جہاں گناہوں کی کثرت ہو اور معاصی پر فخر کیا جاتا ہو، اس معاشرے کے لوگ صبح و شام دنیوی لذت اور خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہوں، اور ہر طرف گناہ ہی کی باتیں کانوں میں پڑتی ہوں، جدھر دیکھیں بے حیائی، فحاشی وعریانی اور اللہ کی نافرمانی کا سیلاب رواں ہو، الغرض اس معاشرے میں ہر برائی موجود اور اچھائی معدوم ہو تو ایسے معاشرے میں رہنے والا مسلمان بھی آہستہ آہستہ اسی کے رنگ میں رنگ جائے گا۔

اس کے اعصاب پر بھی دین کے حوالے سے کمزوری وسستی طاری ہو جائے گی اور زیادہ عرصے تک معاشرے کی اس برائی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو سستی و کاہلی کا شکار ہونے کے بعد وہ بھی عبادات اور دیگر دینی امور میں غفلت برتنا شروع کر دے گا، پھر وہ اس معاشرے کا تابع ہو کر کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کے معاشرے سے ہجرت کا حکم دیا ہے تاکہ ان کا دین محفوظ رہ سکے اور مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے بھی برے لوگوں کی صحبت اور ان کے ماحول کو اپنانے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ اس ماحول کی وجہ سے مسلمان کی دینداری اور تقویٰ متاثر نہ ہو۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اچھے اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ مشک والا اور بھٹی میں

دونکنی پھونکنے والا، تو مشک والے سے یا تم خوشبو خریدو گے، نہیں تو اس کی خوشبو تو تمہیں معطر کر ہی دے گی، جبکہ بھٹی پھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا، نہیں تو اس کی کریہہ بدبو تو تمہیں متاثر کر ہی دے گی۔" (صحیح البخاری: کتاب البیوع)

(6) کم ہمت اور خود غرض لوگوں کی مصاحبت وہم نشینی

سستی و بے حسی طاری ہونے میں اس سبب کا بھی بہت بڑا عمل دخل ہے، بظاہر تو یہ سابقہ سبب جیسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن ان دونوں میں فرق ہے، وہ اس طرح کہ اس سے پہلے سبب میں برے ہم نشینوں کا ذکر تھا، لیکن کم ہمت اور خود غرض ہم نشین اور مصاحب ہمیشہ برا نہیں ہوتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اہل صلاح اور اہل خیر یعنی نیک لوگوں میں سے ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بھی ہوگا کم ہمت اور خود غرض، جس کی وجہ سے اس کے ارادے نہایت پست ہوں گے، وہ کوئی بڑا کام اپنے ذمہ نہیں لے سکتا اور خود غرض ہونے کی وجہ سے اس وہ ہمیشہ ذاتی مفادات کے لیے سوچے گا اور انہی کو اپنے مدنظر رکھے گا، ایسے شخص کی صحبت سے انسان آہستہ آہستہ اس کی طرح بے ہمت اور سست و کاہل ہوتا چلا جائے گا۔

اس کے ارادے پست ہوں گے اور نشاط وچستی اس سے دور ہو جائے گی، ہمت ٹوٹ جائے گی اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوگا، چونکہ بے خبری میں بہت جلدی کسی کی صحبت کا اثر ہوتا ہے، اسی لیے کسی شاعر نے کہا ہے:

لا تصحب الکسلان فی حالاتہ

کم صالح بفساد آخر یفسد

عدوی البلید الی الجلید سریعة

کالجمرة یوضع فی الرماد فیخمد

ترجمہ: ''کسی سست و کاہل اور بے حس آدمی کی صحبت مت اختیار کر،
اس لیے کہ بہت سے صالح اور نیک لوگ دوسروں کی صحبت کی وجہ
سے برے ہو گئے،
سست شخص کی سستی کی بیماری چست آدمی تک جلدی متعدی ہوتی ہے،
جیسا کہ چنگاری کو راکھ کے اندر رکھا جائے تو وہ بھی بجھ جاتی ہے۔''

اسی طرح فارسی میں کہا جاتا ہے:

صحبت صالح تر صالح کند
صحبت طالح تر طالح کند
یعنی نیک کی صحبت تجھے بھی نیک بنادے گی
اور برے کی صحبت سے تم بھی برے بن جاؤ گے

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ہم نشینوں اور ساتھیوں سے بہت جلدی متاثر ہو جاتا ہے، اگر انسان کسی ایسی جماعت کے ماحول کو اپنائے جن کے اندر کوئی خاص بات ہو تو صحبت کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ بات اس تک بھی منتقل ہو جائے گی، اگرچہ وہ شخص اس سے بچنے کی کتنی کوشش کرے، مگر نہیں بچ سکتا، تاہم اس میں کچھ وقت لگے گا، جیسے کہ ایک رسی کو پتھر کے اوپر حرکت دی جائے تو رسی کے نشانات پتھر پر ظاہر ہوتے ہیں، باوجودیکہ رسی نرم اور پتھر سخت ہوتا ہے۔

چونکہ رسی متحرک اور پتھر ساکت ہے، لیکن پھر بھی رسی اپنا نشان چھوڑ دیتی ہے، اس لیے کہ مشاہدہ ہے کہ کسی ساکت و ساکن چیز کے مقابلے میں متحرک چیز زیادہ اثر پذیر ہوا کرتی ہے، اسی طرح اس جماعت کی مثال بھی ہے، کیونکہ وہ اس کام کے

کرنے میں متحرک ہے اور نہ کرنے والا ہم نشین ساکت ہے۔

اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

الرجل علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل

ترجمہ: "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، تم میں ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دیکھ لے کہ وہ کس کو اپنا دوست بنا رہا ہے۔" (جامع الترمذی: کتاب الزهد)

عام طور پر مسلمان سستی و بے حسی کا شکار اس لیے ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری سے غافل ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ اس امت مسلمہ کے ذمہ کتنا بڑا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ کام اس کے ذمہ میں لگایا ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کا ہوا کرتا تھا، اس اجتماعی ذمہ داری سے تقریباً سارے مسلمان غافل ہو چکے ہیں۔

وہ بس اپنی ذاتی ذمہ داری کو ہی محسوس کرتے ہیں اور اسی کے گردان کے ارادے کا دائرہ گھومتا ہے، لیکن اسے امت کا کوئی فکر نہیں ہے، نہ امت کے درد مشترکہ کا اسے کوئی احساس ہے، امت کے زخموں سے اسے کوئی سروکار نہیں اور نہ اس کی تکلیف سے اسے کوئی غم ہے۔

تو جس شخص کا یہ حال ہو تو اس کا ہم نشین ساتھی کو اس کی یہ بیماری لاحق ہو جائے گی، جیسے کہ خارشی اونٹ کی بیماری تندرست اونٹ تک بھی متعدی ہو کر اسے متاثر کرتی ہے، اگرچہ اسلام میں عدوی یعنی متعدی ہونے اور بدشگونی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

(7) معاصی، منکرات اور حرام کھانا

یہ بھی سستی و بے حسی کے اسباب میں سے ہیں، چونکہ گناہ اور معاصی دنیا میں روحانی بوجھ ہیں، جن سے انسان کا دل بوجھل ہو جاتا ہے، پھر قیامت کے دن یہ بوجھ جسم پر بھی پڑے گا اور جسم بھی گناہوں کا بوجھ محسوس کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (سورۃ العنکبوت: 13)

ترجمہ: ''اور اپنے گناہوں کے بوجھ بھی ضرور اٹھائیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ

ترجمہ: ''اور وہ اس وقت اپنے پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے، (لہٰذا) خبردار رہو کہ بہت برا بوجھ ہے جو یہ لوگ اٹھا رہے ہیں۔''
(سورۃ الانعام: 31)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''معاصی اور گناہوں کی وجہ سے انسان سست و بے حس ہو جاتا ہے، ان کے وبال کی وجہ سے انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق بہت ہی کمزور ہو جاتا ہے۔

تعلق مع اللہ جب کمزور ہو جائے تو انسان کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا بہت بھاری ہو جائے گا، نیکی کی طرف قدم اٹھانا بھی بوجھ محسوس ہوگا، قدم اٹھاتے بھی نہیں اٹھیں گے، تو گناہ ایک ایسی ناپاک چیز ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کے

راستے کی رکاوٹ اور علم دین کے حصول سے مانع بنتا ہے، گناہ گار طالب علم طلب علم میں محنت نہیں کرسکتا۔

اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور ارادے پست ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور علم دین کے حصول کے لیے مضبوط اور تندرست دل کی ضرورت ہے، جب دل گناہوں کی وجہ سے بیمار ہو کر کمزور ہو جائے گا تو وہ نہ رجوع الی اللہ کے قابل رہے گا اور نہ علم دین کا حصول اس کے لیے ممکن رہے گا۔

پھر گناہوں کی جتنی کثرت ہوگی دل بھی اتنا ہی کمزور ہوگا حتیٰ کہ گناہوں کی نحوست کی وجہ سے ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ سے تعلق ٹوٹ جائے، جس کے بعد اس انسان کی تباہی و بربادی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا، اللہ سب کو بچائے۔" (الجواب الکافیہ ص 48)

حرام سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ مشتبہات سے بچا جائے

تو گناہ صرف سستی و کاہلی اور بے حسی کا سبب نہیں بنتے، بلکہ بسا اوقات ان کی نحوست کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ سے بالکل کٹ جاتا ہے، کسی بھی عبادت کی بجا آوری نہیں کرسکتا، لیکن عام طور پر مسلمان کبھی کبھار سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی چست و بیدار ہو کر اللہ کی عبادت بھی کرتا ہے۔

دین کی دعوت بھی دیتا ہے اور طلب علم میں محنت بھی کرتا ہے اور بہت سے گناہوں کو بھی چھوڑتا ہے، خاص کر کے جبکہ وہ صغائر ہوں، لیکن گناہوں کی عادت کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہ چستی بھی ختم ہو جائے گی اور وہ مکمل غافل اور سست ہو جائے گا۔

اسی طرح حرام کھانے سے بھی انسان پر غفلت اور سستی طاری و بے حسی طاری ہو جاتی ہے، حرام کے ساتھ ساتھ مشتبہات سے بھی پرہیز کرنا چاہیے، اس لیے کہ

مشتبہات یعنی ایسی چیزیں جن کے حلال یا حرام ہونے کے حوالے سے شک ہو تو ان کا چھوڑنا اس لیے ضروری ہے کہ ان کے عادی ہونے کے بعد انسان آہستہ آہستہ حرام میں بھی واقع ہو جاتا ہے۔

اور یہ مشتبہ چیزیں حرام کے لیے ایک راستہ اور سبب بن جاتی ہے، اس لیے ہر قسم کی مشتبہ اور حرام چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، حرام کا تعلق بھی صرف کھانے پینے کے ساتھ نہیں ہے، بالکل انسان اپنے تمام اعضاء کو حرام امور سے بچائے، حرام دیکھنے سے، سننے سے، بولنے سے، سوچنے سے وغیرہ۔

ہم چونکہ فتنے کے زمانے میں جی رہے ہیں، اس لیے آج کل سب سے زیادہ جس چیز سے بچنے کی ضرورت ہے وہ ہے حرام دیکھنا، یعنی بدنظری، اس زمانے میں بدنظری کی بیماری عام ہوگئی ہے، بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو اس وبا سے بچے ہوئے ہیں، حالانکہ حدیث پاک میں حرام دیکھنے کو ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر قرار دیا گیا ہے، جو ظاہری بدن کو زخمی نہیں کرتا۔

تاہم اس کی وجہ سے دل گھائل ہو جاتا ہے، اس پر ایسی بے حسی طاری ہو جاتی ہے کہ گناہ کرنا اس کے لیے آسان اور نیکی کرنا مشکل ہو جاتا ہے، مذکورہ گناہوں سے اجتناب کا طریقہ اور ان کا علاج اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بیان کیا گیا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (سورة النور: 30)

ترجمہ: ”مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہی ان کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے۔“

کان، آنکھ اور دل کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (سورۃ الاسراء: 36)

ترجمہ: ''اور جس بات کا تمہیں یقین نہ ہو (اسے سچ سمجھ کر) اس کے پیچھے مت پڑو، یقین رکھو کہ کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں (تم سے) سوال ہوگا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی اس کا علاج ہوسکتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

ترجمہ: ''اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (سورۃ البقرۃ: 168)

اسی طرح متعدد احادیث میں بھی اس کا علاج بیان کیا گیا ہے، جیسے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بے شک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے (کہ شریعت میں تمام حلال و حرام چیزوں کو واضح کر کے بیان کیا گیا ہے لیکن) ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہات ہیں، (یعنی ان کا حلال یا حرام ہونا واضح نہیں ہے) جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

سو جس نے اپنے آپ کو ان مشتبہات سے بچایا تو درحقیقت اس نے اپنے دین

اور عزت کو محفوظ کرلیا...... جان لو کہ جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جائے تو پورا بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو پورا بدن خراب ہو جاتا ہے، جان لو کہ وہ دل ہے۔'' (صحیح البخاری: کتاب الایمان)

اب سوال یہ ہے کہ کونسی چیز مشتبہ یا حرام ہے اور اس کو ہم کیسے پہچانیں گے تو اس کا آسان جواب حدیث پاک میں دیا گیا ہے، رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

دع ما یریبك الی مالا یریبك (جامع الترمذی: کتاب القیامة)

ترجمہ: ''جو چیز تمہیں شک میں ڈال دے اسے چھوڑ دو اور اس چیز کو اپنا لو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے۔''

(8) ہدف مقرر نہ کرنا

اپنے لیے ایک ہدف وٹارگٹ مقرر نہ کر کے کسی کام میں لگ جانا بھی سستی وکاہلی اور بے حسی میں مبتلا ہونے کا بہت بڑا سبب ہے۔ بہت سے لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں، بہت سے دین کی دعوت کے کام میں لگ جاتے ہیں، لیکن ان کے سامنے کوئی ہدف نہیں ہوتا۔

وقتی طور پر وہ بہت محنت بھی کر رہے ہوتے ہیں، مگر کچھ دنوں بعد وہ ہمت ہار کر بیٹھ جائیں گے اور ایسے ہی ہوں گے جیسے کہ پہلے تھے، اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے ایک عالی کام شروع تو کیا لیکن اپنے لیے کوئی ہدف مقرر نہیں کیا۔

اگر ہدف مقرر بھی کیا ہے تو وہ محدود اور سطحی قسم کا ہدف ہوتا ہے، اس لیے اس کے حصول کے لیے انسان دیر پا محنت نہیں کر سکتا، یا یہ کہ اس نے دوسروں کو دیکھا اور کسی کام میں لگ گیا کہ وہ یہ کام کر رہا ہے، اس لیے میں بھی کرتا ہوں، کچھ دن تو وہ اس کی دیکھا دیکھی میں وہ کام کرے گا، کچھ کامیابی بھی حاصل کرے گا، لیکن نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ دنوں بعد اعصاب پر سستی سوار ہو جائے گی اور ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا۔

اچانک اور بغیر سوچے سمجھے اور ہدف مقرر کیے کوئی کام شروع کرنے والے لوگ بہت بڑا کام شروع تو کرتے ہیں، لیکن ہدف نہ ہونے کی وجہ سے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قبل ہی دوسرا بڑا کام شروع کرتے ہیں اور اسے بھی ادھورا چھوڑ کر کسی تیسرے کام میں شروع ہو جاتے ہیں، یوں ان کی زندگی گزر جاتی ہے اور کسی ایک کام کو انجام تک نہیں پہنچا سکتے۔

حالانکہ حدیث پاک میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

احب الاعمال الی اللہ ادومها و ان قل (صحیح البخاری: کتاب الرقاق)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جو دائمی اور مستقل ہو، اگرچہ تھوڑا ہو۔''

بہر حال کسی کام کے اہداف کا واضح ہونا نہایت ہی ضروری ہے اور اس کا اہم اور عالی ہونا بھی ضروری ہے، جب ہدف واضح ہو تو کام کرنے میں انسان دلچسپی بھی لے گا اور جلدی سستی کا شکار بھی نہیں ہوگا۔

پھر ہدف جتنا اہم اور بلند ہوگا، کام کرنے میں دلچسپی بھی اتنی بڑھے گی، لیکن اس کے برعکس اگر کسی کام کا ہدف ہی واضح نہ ہو یا ہدف سطحی قسم کا ہو یا اچانک دوسروں کو دیکھ کر بغیر ہدف مقرر کیے کوئی کام شروع کیا جائے تو انسان بہت جلدی ہمت ہار بیٹھے گا اور سستی کا شکار ہو جائے گا۔

(9) اہداف یا وسائل پر اعتقاد کا کمزور ہونا

سستی و بے حسی کا یہ سبب پہلے والے سبب سے جدا اور مختلف ہے، اس لیے کہ یہاں ہدف و ٹارگٹ واضح اور محدود ہے، اسی طرح اس ہدف و مقصد کے حصول کے لیے اپنائے جانے والا وسیلہ و ذریعہ بھی واضح ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگوں کا اس ہدف یا اس کے وسیلے پر اعتقاد کمزور ہوتا ہے۔

جس کی وجہ سے ان پر سستی طاری ہو جاتی ہے، مثلاً ایک آدمی کسی راستے پر چلتا ہے، کسی بھی مقصد کے لیے، لیکن راستے اور اس مقصد کے واضح ہونے کے باوجود کچھ ہی دیر بعد وہ سستی و کاہلی یا تھکاوٹ کا شکار ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

مذکورہ سبب کو سمجھنے کی ایک آسان مثال

مثلاً کسی روحانی مرض کی تشخیص پر دو یا دو سے زیادہ آدمی متفق ہو جاتے ہیں کہ فلاں شخص کو یہ بیماری لاحق ہے، لیکن اس کے علاج کے لیے اپنائے جانے والے وسائل پر ان کا اختلاف ہو جاتا ہے۔

زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ اس کا علاج عمومی طریقہ علاج سے ہونا چاہیے، کہ اس میں دعوت، تربیت، طلب علم سمیت وہ تمام وسائل اپنائے جانے چاہئیں جنہیں شریعت نے مقرر کیا ہے، کسی ایک جانب پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام طریقوں کو اپنانا چاہیے۔

لیکن بعض لوگ اس بات پر زور لگاتے ہیں کہ اس کا علاج صرف ایک ہی طریقے مثلاً طلب علم سے ہونا چاہیے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا علاج خصوصی

تربیت کے ساتھ ہونا چاہیے یا صرف دعوت سے ہونا چاہیے۔

اب سب لوگوں کے مشوروں پر چلنے والا شخص لازمی بات ہے کہ ان کے بتائے ہوئے وسائل سے مایوس ہوگا اور ان پر اس کا اعتماد ٹوٹ جائے گا، جب بروئے کار لائے جانے والے وسائل پر اعتماد نہ رہے گا تو زیادہ دیر تک انسان ان کو اپنا بھی نہیں سکتا، بلکہ جلد یا بدیر سستی و کاہلی کا شکار ہو کر بیٹھ جائے گا۔

دیکھیں، یہاں وسائل بھی معلوم اور واضح ہیں اور ہدف و مقصد بھی متعین ہے، لیکن اس کے باوجود بھی انسان سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے اہداف یا وسائل پر اعتقاد و اعتماد کا کمزور ہونا بھی سستی کا ایک بڑا سبب ہے۔

(10) حقیقت پسندی کا فقدان یا کمی

حقیقت پسندی کی کمی یا اس کا فقدان بھی سستی و کاہلی کا باعث بنتا ہے، یہ ایک وسیع مفہوم ہے، جس کے تحت بہت سے جزئیات شامل ہیں، جن کا احاطہ اور شمار کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی عبادات اور ان پر ملنے والے بدلے اور جزاء میں تناسب نہ ہو، جو کام کر رہا ہے وہ مقصد و ہدف کے ساتھ مناسبت نہ رکھتا ہو، اس کا شکار ایک فرد بھی ہوسکتا ہے اور ایک معاشرہ بھی اجتماعی طور پر اس میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ حقیقت پسندی کا فقدان عام طور پر اسباب و وسائل میں ہوتا ہے اور اہداف و مقاصد میں بھی ہوسکتا ہے۔

اس کا شکار مسلمان کبھی عمل میں حد درجے تک غلو سے کام لیتا ہے اور اتنا زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو عام طور پر انسان کے بس میں نہیں ہوتا، اور کبھی عمل میں کمی کی صورت میں بھی اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے، خلاصہ یہ کہ اس کے اعمال اہداف و مقاصد کے موافق نہیں ہوتے، آگے ہم اس کی چند مثالیں اور صورتیں آپ کے سامنے رکھیں گے، جس سے مزید وضاحت ہو جائے گی۔

دین میں غلو اور شدت

(الف): یہ حقیقت پسندی کے فقدان کی ایک صورت ہے، چونکہ یہ ایک نقصان دہ طرز عمل ہے، اس لیے بہت سی آیات اور احادیث میں اس سے منع کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (سورة النساء171)

ترجمہ: ''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔''

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورة الحديد:27)

ترجمہ: ''اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے، وہ انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی، ہم نے اس کو ان کے ذمے واجب نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی، پھر اس کی ویسی رعایت نہ کر سکے جیسے اس کا حق تھا۔''

اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا (سورة البقرة:286)

ترجمہ: ''اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔''

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورة الحج: 78)

ترجمہ: ''اس نے تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

جناب رسول کریم ﷺ نے دین میں غلو سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

ايا كم والغلو فی الدين فانما اهلك من كان قبلكم الغلو فی الدين (سنن النسائي: كتاب مناسك الحج)

آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا:

هلك المتنطعون ثلاثا (صحیح مسلم: کتاب العلم)

ترجمہ: ''غلو اور تکلف سے کام لینے والے ہلاک ہو گئے۔''

تھوڑی مگر مستقل ودائمی عبادت اللہ کو پسند ہے

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئے اور ان کے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ خاتون کون ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ فلاں خاتون ہے، اس کی نماز کا ذکر کیا (کہ یہ ایسی عبادت گزار خاتون ہے) تو آپ نے فرمایا کہ بس کرو، تم لوگوں پر اتنی ہی عبادت کرنا لازم ہے، جتنی کہ تم استطاعت رکھتے ہو، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اجر وثواب دیتے نہیں تھکے گا۔

یہاں تک کہ تم خود تھک کے بیٹھ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کو وہ عبادت پسند ہے جس پر انسان ثابت قدم رہے اور ہمیشہ کرتا رہے، (چاہے تھوڑا عمل ہی کیوں نہ ہو لیکن مداومت اختیار کرنی چاہیے) (صحیح البخاری، کتاب الایمان و مسلم کتاب صلاۃ المسافرین)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک رسی دیکھی جو دو ستونوں کے درمیان باندھی ہوئی تھی، دریافت فرمایا: یہ رسی کیسی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ زینب کی رسی ہے، جو انہوں نے اس لیے باندھ رکھی ہے، جب سستی طاری ہوتی ہے تو اس کے ساتھ لٹک جاتی ہیں، (تاکہ سستی دور ہو اور چست ہو کر عبادت کریں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حلوه، ليصل احدكم نشاطه، فاذا فتر فليرقد

اسے کھول دو، تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ چستی اور نشاط کے ساتھ نماز پڑھے، جب سستی طاری ہو جائے تو لیٹ جائے۔(صحیح البخاری: کتاب التہجد)

حقیقت پسندی کی کمی اور فقدان کی ایک صورت

(ب) حقیقت پسندی کے فقدان کی ایک صورت یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک چست اور سرگرام نوجوان ہے، جو دین کے کاموں، دعوت الی اللہ یا طلب علم میں بڑی سرگرمی دکھاتا ہے، اس کے لیے رات دن محنت کرتا ہے، گرمی یا سردی کی کوئی پروا نہیں کرتا، ہر وقت لگا رہتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے وہ اپنے گھر والوں اور اہل وعیال کے حقوق کا خیال نہیں رکھتا۔

اسی طرح اپنے نفس کے حقوق کو بھی پامال کرتا ہے، رشتہ داروں اور دوست احباب کی کوئی خیر خبر نہیں لیتا، ہر وقت دینی کاموں میں مگن رہتا ہے، اس کی وجہ سے وہ شادی کر کے گھر بھی نہیں بساتا، یوں اس کی زندگی گزرتی رہتی ہے، مگر کچھ سال گزرنے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کمی کوتاہی کی ہے، جس کے بعد وہ ان کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے اور اس پر اپنے نفس کو ٹوکتا رہتا ہے۔

اس دوران ازلی دشمن شیطان ملعون اپنا کام دکھاتا ہے اور اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ دیکھو جناب! آپ نے تو عمر ضائع کر دی، آپ کے دوستوں اور ہم عمروں نے شادیاں کر کے گھر بسا لیے، اور اب وہ صاحب اولاد ہیں، دولت کمائی ہے اور کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، مگر آپ کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ آپ نے فضول کام میں وقت ضائع کر دیا ہے، یہاں سے شیطان کے وساوس اور

بہکانے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

اور یہ شخص اوہام وخیالات کے گہرے سمندر میں داخل ہوجاتا ہے، جس کے بعد وہ ذہنی طور پر پریشان ہوکر بہت سے اعمال اور عبادات میں سستی وکاہلی کا شکار ہوجاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ وہ کسی کام کا نہیں رہتا، اس لیے کہ دنیا تو ویسے بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی، عمر کا زیادہ حصہ بیت چکا ہے اور شیطان نے اس کو بہکا کر اعمال سے بھی دور کردیا تو آخرت بھی خراب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

تو ہر کام شریعت کے مطابق ہونا چاہیے، جس کام کی ابتدا شریعت کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر نہ کی جائے تو اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، مگر جسے اللہ بچانا چاہے وہی بچ سکتا ہے، ورنہ شیطان کے مکروفریب سے بچنا بہت ہی مشکل ہے۔

اس لیے شادی کرنا، اہل وعیال کے حقوق ادا کرنا، رشتہ داروں سے تعلقات قائم رکھنا یہ سب وہ امور ہیں، جن کا شریعت نے انسان کو پابند بنایا ہے، ان کو یکسر چھوڑ کر دین کے کاموں میں لگ جانا بھی شریعت پر عمل نہ کرنے کے مترادف ہے۔ جس کا نتیجہ شرعی امور میں کوتاہی یا سستی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

حقیقت پسندی کی کمی اور فقدان کی دوسری صورت

(ج) حقیقت پسندی کے فقدان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک فرد یا ایک جماعت اپنے لیے کوئی ایسا ہدف مقرر کرے جو غیر حقیقی ہو، اگرچہ وہ ہدف شرعاً جائز ہو، لیکن حالات یا وقت یا جگہ کے تقاضے کے مطابق نہ ہو۔

تو اس قسم کے ہدف یا مقصد کے حصول کے لیے جب محنت ہوتی رہے اور وسائل بروکار لائے جاتے رہیں تو دن، مہینے بلکہ سال گزرتے چلے جائیں گے اور کوئی خاطر

خواہ نتیجہ سامنے نہیں آسکے گا، اس لیے کہ جس ہدف ومقصد کے لیے محنت ہورہی ہے، وہی موقع محل یا وقت کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے، تو اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں نکلے گا، جس کے بعد خود بخود سستی وتھکاوٹ یا مایوسی کے آثار ظاہر ہوں گے تو آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے اس جماعت کے افراد اس کام سے ہٹتے چلے جائیں گے۔

اس طرح آخر کار سبھی ہار مانیں گے اور تھک کر بیٹھ جائیں گے اور اگر کچھ لوگ باقی بھی بچیں گے تو وہ بھی ہدف کے غیر حقیقی ہونے کی وجہ سے ایک نہ ایک دن اسے ادھورا چھوڑ ہی دیں گے، اس لیے ہدف کا حقیقی ہونا اور موقع محل، وقت اور حالات کے مطابق ہونا انتہائی ضروری ہے۔

حقیقت پسندی کی کمی اور فقدان کی تیسری صورت

(د) حقیقت پسندی کے فقدان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان کسی ایک ہی چیز کے پیچھے پڑ جائے اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے، اسی کے لیے صبح وشام محنت کرے، لیکن اس کی وجہ سے وہ دوسری اہم چیزوں کے حصول یا ان کے لیے محنت کرنے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو، یوں وہ اسی کام میں لگا رہتا ہے اور دن، مہینے بلکہ سال گزرتے چلے جاتے ہیں۔

وہ اگرچہ اس کام میں دل لگا کر محنت کررہا ہے، لیکن دوسری اہم چیزیں اس کی وجہ سے اس سے چھوٹ جاتی ہیں، مثلاً ایک دینی طالب علم کسی ایک ہی اہم فن کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور اسی فن کے لیے سالہا سال محنت کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ دیگر علوم و فنون سے غافل ہوجاتا ہے اور جب عمر کا کافی حصہ گزر جاتا ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے، اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس نے ایسی کچی زمین پر عمارت تعمیر کی

ہے اور اس کی بنیادیں ایسی کمزور ہیں کہ وہ عنقریب گر جائے گی۔

اگر چہ وہ فن بہت ہی اہم ہے، لیکن اہم فنون کو شروع کرنے سے پہلے مبادیات اور بنیادی فنون کا علم سیکھنا ضروری ہوتا ہے، ویسے بھی تمام علوم دینیہ ایک دوسرے کے لیے مدد و معاون اور سیڑھی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ایک ہی فن کو جب پڑھے گا تو اس میں بھی مہارت حاصل نہیں کرسکتا اور وقت اس نے ویسے بھی ضائع کر دیا ہے، اس لیے وہ اپنے کئے پر پچھتائے گا اور آخر کار ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا اور اس پر سستی چھا جائے گی اور سابقہ محنت کا کوئی نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

والربانیون و الاحبار (سورئہ مائدہ:44)

میں ''ربانیون'' کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ علما ہیں جو لوگوں کو پہلے بنیادی علوم و فنون سکھاتے ہیں اور اہم اور بڑے علوم کی تعلیم بعد میں دیتے ہیں، جیسے کہ ہمارے مدارس میں پہلے نحو و صرف سمیت دیگر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کے بعد اہم فنون یعنی علم تفسیر اور علم حدیث پڑھائے جاتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص اس ترتیب کے برخلاف چلے گا تو نہ تو وہ کسی فن میں مہارت حاصل کر سکے گا اور نہ ہی زیادہ عرصے تک وہ محنت اور کوشش کو برقرار رکھ سکے گا، بلکہ ایک نہ ایک دن سستی و کاہلی کا شکار ہو کر بیٹھ جائے گا، جبکہ عمر ضائع ہونے کا نقصان الگ ہے۔

حقیقت پسندی کی کمی اور فقدان کی چوتھی صورت

(ھ) حقیقت پسندی کے فقدان کی ایک اور صورت یہ بھی ہے اور بہت سے لوگ اس کی وجہ سے سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ انسان اپنے نفس کی بنیادی ضروریات کا خیال نہ رکھے، جیسے کہ کھانا پینا اور سونا سمیت ان چیزوں کی طرف زیادہ دھیان نہ دے، جن پر اس کی صحت کا دارومدار ہے۔

عام طور پر لوگ نفس کی بنیادی ضروریات کے حوالے سے بہت زیادہ افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ ان دونوں صورتوں میں انسان سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، مناسب کھانا پینا اور سونا انسان کے بدن کی بنیادی ضروریات اور حقوق میں سے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ولبدنك عليك حقا (صحيح البخاري: كتاب الصوم)

ترجمہ: ''تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

جس طرح کھانے پینے اور سونے میں زیادہ مبالغہ سے کام لینا انسانی صحت کے لیے مضر ہے، اسی طرح اس ان چیزوں کا مناسب مقدار سے کم ہونا بھی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، جب صحت خراب ہو جائے گی تو لازمی بات ہے کہ سستی و کاہلی چھا جائے گی۔

بات سمجھنے کے لئے ایک بہترین مثال ملاحظہ کیجئے

ہم ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں، وہ ہے نیند: چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

''دل کو فاسد اور خراب کرنے والے عوامل میں سے ایک کثرتِ نیند بھی ہے، اس سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے، بدن بوجھل ہو جاتا ہے، وقت ضائع ہو جاتا ہے، انسان غفلت اور سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، نیند کی کچھ صورتیں انسانی صحت کیلئے بہت زیادہ نقصان دہ ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ فجر کی نماز سے لے کر طلوع آفتاب تک سونا بہت ہی ناپسندیدہ اور نقصان دہ ہے، کیونکہ یہ وقت غنیمت ہوا کرتا ہے۔

انسانی بدن اور صحت کے لیے مفید نیند رات کے آدھے حصے سے پہلے کا سونا ہے، اسی طرح رات کے آخری چھٹے حصے میں سونا بھی مفید ہے، یہ کل ملا کر زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے بنتے ہیں اور اطبا کے نزدیک بھی نیند کی یہی مناسب مقدار ہے، اگر نیند کی مقدار اس سے بہت زیادہ یا بہت کم ہو جائے تو اس کے منفی اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ جس طرح زیادہ سونا کئی مفاسد اور خرابیوں کو جنم دیتا ہے، اسی طرح نیند کو بالکل ہی ترک کرنا یا مناسب مقدار سے کم کرنا بھی اس سے بڑی آفات و نقصانات کا باعث بنتا ہے، اس سے انسان کا مزاج خراب ہوتا ہے، دماغ پر خشکی طاری ہوتی ہے، جس کے بعد دماغ صحیح طرح کام نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ بھی بہت سے امراض لاحق ہو جاتے ہیں، جن کے ہوتے ہوئے انسان اپنے دل اور بدن سے درست کام نہیں لے سکتا۔

معلوم ہوا کہ ہر عمل کی طرح نیند کے عمل میں بھی اعتدال کا دامن تھامنا چاہئے اور یہی ہر عمل میں کامیابی کی ضمانت ہے۔''

(مدارج السالکین: ۱/459)

اعتدال پسندی دین اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے

خلاصہ یہ کہ انسان کی جسمانی ضروریات کے حوالے سے اعتدال کا راستہ اپنانا کافی مشکل امر ہے، لیکن قرآن وسنت میں اس مشکل کا حل اور اس مرض کا علاج بیان کیا گیا ہے۔ شریعت اسلامی نے ہر کام میں انسان کو اعتدال کا راستہ اپنانے کی تاکید کی ہے اور اعتدال اس دین حنیف کی بنیادی خصوصیت ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں افراط وتفریط ایک زہر قاتل اور مرض مہلک ہے۔

یہاں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ بعض لوگ اس حقیقت پسندی کے نام سے ایک انتہائی منفی اور خطرناک رجحان کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

لا يكلف الله نفسا الا وسعها (سورة البقرة: 286)

کا تکیہ لیتے ہوئے ہر محنت طلب کام سے جی چراتے ہیں، حالانکہ یہ انسان کیلئے ایک مہلک بیماری ہے، اس آیت کا یہ مطلب اور مفہوم ہرگز نہیں ہے، وہ اسے اپنی بے جا آرام طلبی کیلئے دلیل بناتے ہیں، جو ان کی نری جہالت اور اس کا مقصد قرآن فہمی سے دوری ہے اور اس کا مقصد محنت سے جان چھڑانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی دلیل میں سچے ہوتے تو ''جہاد'' و ''مجاہدہ'' اور ''صبر'' و ''مصابرہ'' کا معنی و مفہوم سمجھ لیتے۔

(11) مشکلات اور رکاوٹیں

اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کا راستہ خاردار کانٹوں سے بھرا ہوا ہے، اس راستے میں قدم قدم پر مصیبتیں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ ایک ایسا پرخطر راستہ ہے، جس پر چلنے والے مسافروں کو کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

قرآن کریم میں اس موضوع کو بہت اہمیت دی گئی ہے، تاکہ دعوت الی اللہ سے منسلک افراد اس سے عبرت حاصل کریں، اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات پر وہ صبر کرسکیں اور مصائب کے باوجود ثابت قدم رہ سکیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ

(سورۃ العنکبوت: 2،1)

ترجمہ: ''الم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا کہ بس وہ یہ کہہ دیں کہ: ''ہم ایمان لے آئے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے؟''

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ

(سورۃ آل عمران: 142)

ترجمہ: ''بھلا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (یونہی) جنت کے اندر جا پہنچو گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے لوگوں کو جانچ کر نہیں دیکھا جو جہاد کریں اور نہ ان کو جانچ کر دیکھا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔''

اس موضوع سے متعلق آیات بہت زیادہ ہیں اور احادیث مبارکہ بھی اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بخاری شریف (کتاب المناقب) میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ ان پر کفار نے دین اسلام اور حق کی پاداش میں مصائب کے پہاڑ توڑے۔ اسی طرح جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی آل پر سے گزر ہوا اور انہیں کفار کی جانب سے عذاب دیا جارہا تھا تو آپ نے ان سے فرمایا:

صبراً آل یاسر فان موعدکم الجنة (مستدرك حاكم)

ترجمہ: ”تمہارے لئے جنت کی بشارت ہے، اے آل یاسر! صبر کا دامن تھامے رکھو۔“

مصائب و آلام اور پریشانیاں و آزمائشیں دین حق کے راستے کا لازمی حصہ ہیں، بلکہ دین کی حقانیت اور سچائی کی علامت ہیں کہ باطل اس کے ماننے والوں کے خلاف ہمیشہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، کیونکہ وہ دلیل کے میدان میں تو حق کو نیچا نہیں دکھا سکتا، اس لئے وہ زبان کی طاقت کے بجائے طاقت کی زبان سے بات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اور یہی باطل کے بطلان کی دلیل اور علامت ہے، یہی تو وجہ ہے کہ دین حق کے ایک داعی کو مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، اسے جیل میں ڈالا گیا، مارا پیٹا گیا، لیکن اس کے بعد اس سے اس آزمائش کے بارے میں پوچھا گیا تو کہنے لگا:

”اگر یہ آزمائش، مشکلات اور مصائب نہ ہوتے تو ہمیں اپنے برحق ہونے کا یقین نہ ہوتا، بلکہ ہم اس حوالے سے شک میں مبتلا ہوتے، ہماری حقانیت کی دلیل یہی آزمائشیں تو ہیں۔“

بعض لوگ دین کی دعوت کا کام بڑی جانفشانی اور محنت کے ساتھ شروع کرتے ہیں اور اس راستے میں کافی ترقی کرتے ہیں، مگر انہیں آزمائش اور ابتلا کی حقیقت کا علم نہیں ہوتا، اگرچہ علمی طور پر انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس راستے میں مصائب آتے ہیں اور وہ ابتلا و آزمائش سے متعلق لمبی چوڑی تقریر بھی کرتے ہیں۔

لیکن حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں، انہیں کبھی اس سے سابقہ نہیں پڑا ہوتا اور نہ انہوں نے عملی طور پر کبھی مصائب و آزمائش کا سامنا کیا ہوتا ہے، تو چونکہ انہیں آزمائش کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا، اس لیے جیسے اس راستے میں کوئی آزمائش یا پریشانی آتی ہے تو وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، شیطان ان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے۔

جس کے بعد وہ آہستہ آہستہ دعوت الی اللہ کے راستے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں، جس چستی اور محنت کے ساتھ انہوں نے دین کے کام کی ابتدا کی تھی، وہ باقی نہیں رہتی، بلکہ بسا اوقات اس راستے کی حقانیت کے حوالے سے ہی شکوک وشبہات کا شکار ہو کر نعوذ باللہ ایمان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آزمائش کی حقیقت کا عملی طور پر سمجھنا ضروری ہے، ورنہ انسان آزمائش کے آتے ہی سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، ایک ایسا شخص جو تاریخ رقم کر سکتا تھا وہ اس کے سبب خود تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا ہے، جو دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بن سکتا تھا، وہ خود گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے، جو معاشرے میں تبدیلی لانے کی صلاحیت سے مالا مال تھا وہ خود معاشرے کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ اس لیے دین حق کی راہ میں آنے والی آزمائشوں کی حقیقت کا ادراک کرنا ضروری ہے۔

مشکلات اور رکاوٹیں عبور کرنے کا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کا ادراک کیسے حاصل ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے، انبیائے کرام علیہم السلام پر آنے والے حالات کا بغور جائزہ لیا جائے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ پر آنے والے مصائب و مشکلات کو مدنظر رکھا جائے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین حق کیلئے جو قربانیاں دی ہیں اور ان پر جو حالات آئے ہیں، انہیں ہمیشہ اپنے ذہن میں تازہ رکھا جائے، اس کے علاوہ دین حق کی سربلندی کے لیے اسلاف نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور دعوت الی اللہ کا مبارک اور عظیم کام سرانجام دینے والے صلحا و علما پر آنے والی آزمائشوں کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو ہر مسلمان کے لیے دین حق کے راستے میں آنے والی آزمائشوں سے نمٹنا آسان ہو جائے گا اور وہ شیطان کے وسوسے میں آکر سستی و کاہلی کا شکار نہیں ہوگا۔

داعی کو چاہیے کہ جب بھی کوئی پریشانی آئے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو اپنے سامنے رکھ کر دل کو تسلی دے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (سورة آل عمران: 200)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! صبر اختیار کرو، مقابلے کے وقت ثابت قدمی دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے جمے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔''

(12) انفرادیت کا فتنہ

اسلام ایک اجتماعی دین ہے، اس میں انفرادیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، سوائے چند عبادات کے، جیسے کہ تہجد وغیرہ کے، باقی تمام دینی امور اور عبادات اجتماعیت سے عبارت ہیں، جیسے کہ نماز با جماعت۔

زکوۃ بھی مالدار اور فقیر کے مابین ایک اجتماعیت کی صورت پیدا کرتی ہے، روزہ بھی سارے مسلمان ایک ہی وقت میں ایک ہی مہینے رکھتے ہیں، پھر حج تو ساری دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعیت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

صومکم یوم تصومون، و فطرکم یوم تفطرون و الاضحی یوم تضحو (جامع الترمذی: ابواب الصیام)

ترجمہ: ''تمہارا روزہ اسی دن شروع ہوگا جس دن سب روزہ رکھیں گے اور تم عید الفطر بھی اسی دن مناؤ جس دن سارے عید منائیں گے اور تم عید الاضحیٰ بھی اسی دن مناؤ جس دن سارے مسلمان منائیں گے۔''

دینی امور سے ہٹ کر دنیوی امور میں بھی انسان اجتماعیت کا محتاج ہے، جیسے انسانی نسل کی بڑھوتری بھی ماں باپ کے باہم ملنے سے ہوتی ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اگرچہ وہ قادر مطلق ذات اس بات پر قادر ہے کہ ماں باپ میں سے کسی ایک سے بچہ پیدا کرے، جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا اور حضرت مریم علیہا السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا، بلکہ وہ ذات پاک تو اس پر بھی

قادر ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر بھی انسان پیدا کر دے، جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔

لیکن اس کے باوجود بھی نسل انسانی سمیت تمام جانوروں کی نسل کو بڑھانے کے لیے اس نے اجتماعیت اور باہمی ملاپ کو ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی امور میں بھی باہمی میل جول اور اجتماعیت کی تعلیم ارشاد فرمائی ہے، جیسے کہ کھانے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اجتمعوا علی طعامکم یبارك لکم فیه (سنن ابی دائود: کتاب الاطعمة)

ترجمہ: ''اپنا کھانا ایک ساتھ مل کر کھایا کرو تا کہ تمہارے لیے کھانے میں برکت ہو۔''

اسی طرح اکیلے سفر سے بھی منع کرتے ہوئے فرمایا:

والثلاثة رکب (سنن ابی داؤد: کتاب الجهاد)

ترجمہ: ''(سفر پر جانے والا ایک آدمی شیطان ہے اور دو بھی دو شیطان ہیں، جبکہ) تین افراد کا پورا قافلہ ہوتا ہے۔''

انفرادیت کی نفی اور اجتماعیت کا ثبوت

تو دینی و دنیوی امور میں اجتماعیت کا اتنا بڑا مقام اور اہمیت ہے تو ہمارے دینی دعوت اور دین کی ترویج کے لیے محنت کے سلسلے میں اجتماعیت کی اہمیت بھی مسلم ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت ساری آیات اور احادیث میں اجتماعیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (سورۃ آل عمران:103)

ترجمہ:''اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو، آپس میں متفرق مت ہو جاؤ۔''

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ

ترجمہ:''نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو۔'' (سورۃ المائدۃ:2)

آپس میں تفرقہ بازی، فرقہ پرستی اور اختلاف سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ

ترجمہ:''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آچکے تھے اس کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اختلاف میں پڑ گئے۔'' (سورۃ آل عمران:105)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ (سورۃ الانعام:159)

ترجمہ:''جان لو کہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا تھا اور گروہوں میں بٹ گئے تھے، ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے حوالے ہے۔''

مذکورہ آیات کے علاوہ اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے متعلق بے شمار احادیث بھی

ہیں، جن میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں:

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

علیکم بالجماعة، و ایاکم و الفرقة، فان الشیطان مع الواحد، وھو من الاثنین ابعد، من اراد بحبوحة الجنة فلیلزم الجماعة

ترجمہ: ''تم پر اجتماعیت لازم ہے اور اپنے آپ کو تفرقہ بازی سے بچاؤ، اس لیے کہ اکیلے انسان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور وہ دو سے دور ہٹ جاتا ہے، جو جنت کے وسط میں گھر چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اجتماعیت کو لازم پکڑے۔'' (جامع الترمذی: کتاب الفتن)

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من فارق الجماعة شبرا فمات، الا کانت میتته میتة الجاھلیة

ترجمہ: ''جو مسلمانوں کی جماعت سے ایک بالشت بھی جدا ہوا اور اسی حالت میں وہ مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔'' (مسند احمد)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

کدر الجماعة خیر من صفو الفرد

ترجمہ: ''جماعت کا گدلا پانی بھی انفرادیت کے صاف پانی سے بہتر ہے۔''

حضرت ابن مبارک کا ایک شعر ہے:

لولا الجماعة ما کانت لنا سبل
ولکان اضعفنا نھبا لأقوانا

ترجمہ: ''اگر جماعت نہ ہوتی تو ہمارے لیے کوئی راستہ نہ ہوتا اور

ہم میں سے کمزور ترین آدمی بھی قوی ترین آدمی کو لوٹ لیتا۔‘‘

قیامت کے دن نجات پانے والا فرقہ کون سا ہوگا؟

ان تمام تفصیلی دلائل سے واضح ہوگیا کہ جماعت ہی اصل ہے، لیکن جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے فرقوں میں سے بھی اہل السنۃ والجماعۃ بھی ان آیات اور احادیث کا مصداق ہے اور یہی طائفہ منصورہ اور نجات پانے والا فرقہ ہے۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض پارٹیاں اور خاص قسم کی جماعتیں قرآن و سنت کے ان دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس سے مراد ہماری جماعت ہے۔

جیسا کہ ’’جماعت المسلمین‘‘ کے نام سے ایک نام نہاد جماعت پاکستان میں بھی ہے اور دوسرے مسلم ممالک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی جماعتوں اور پارٹیوں کو ان آیات واحادیث کا مصداق قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ کسی مفسر یا محدث نے ان نصوص کا یہ مطلب بیان نہیں کیا، بلکہ سب نے ان کا مصداق اہل السنّت والجماعت کو قرار دیا ہے اور اہل السنّت والجماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔

تو جو شخص اس جماعت ناجیہ سے جدا ہوکر اور کٹ کر اپنے لیے کوئی الگ راستہ متعین کرے گا اور اس شاہراہ اور سواد اعظم کو چھوڑ کر کسی اور پگڈنڈی پر چلے گا یا اجتماعیت کو چھوڑ کر انفرادیت کی زندگی اپنائے گا اور گوشہ نشینی اختیار کرے گا تو اس کا

شیرازہ بکھر جائے گا اور قوت منتشر ہو جائے گی۔

اس کے اعصاب پر ایک نہ ایک دن سستی و کاہلی چھا جائے گی، وہ کسی نہ کسی موڑ پر اکتا جائے گا، کیونکہ اس انفرادی راستے میں کوئی اس کا ساتھ دینے والا اور ہمت باندھنے والا نہیں ہوگا۔

اس کی مثال لق و دق صحرا میں اگنے والے اس پودے کی طرح ہوگی جو ایک نہ ایک دن طوفانی تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز آکر ختم ہو جائے گا، یا اس بکری کی طرح ہوگا، جو ریوڑ سے الگ تھلگ ہو کر کسی گھاٹی میں بھیڑیے کی خوراک بن جائے گی، سچ فرمایا محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے:

انما يأكل الذئب من الغنم القاصية (سنن ابی دائود : کتاب الصلاة)

ترجمہ: ''بھیڑیا اسی بکری کو کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے دور چلی جائے۔''

(13) عمل کے میدان اور دعوت کے مراحل میں جمود کا شکار ہونا

رسول کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کے مراحل میں جدت آتی گئی، ایک مرحلہ اور طریقے سے آپ دوسرے نئے مرحلے اور طریقے کی طرف منتقل ہوتے چلے گئے، چونکہ وقت اور ماحول کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حالات اور افراد کی مناسبت سے دعوت کے طریقوں میں تبدیلی لائی جائے۔

لیکن اس کے برعکس بہت سے دینی کام کرنے والے لوگوں اور جماعتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک ہی طریقے پر سختی سے کاربند ہوتی ہیں، حالات اور وقت کے تقاضوں کی تبدیلی کے باوجود وہ اپنے طرز عمل اور طریقے میں ذرا بھی تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔

حالانکہ ان کا اختیار کردہ طریقہ اور طرز عمل کوئی دلیل قطعی سے ثابت شدہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک اجتہادی معاملہ ہوتا ہے تو اس کا نقصان یہ ہوگا کہ انسان ایک نہ ایک دن سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا، انسانی طبیعت اور فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ایک ہی چیز سے اکتا جاتا ہے، حالات اور ماحول کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل اور طریقے میں تبدیلی لائی جائے تو اس چیز کو مدنظر نہ رکھنے والے داعی آخر کار کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اس لیے دین کے داعیوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس اہم ترین پہلو کو ہمیشہ مدنظر رکھیں، اس حوالے سے قرآن وسنت کے بتائے ہوئے اصولوں سے رہنمائی حاصل

کریں، جب وہ سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں گے تو خود ان کے سامنے واضح ہو جائے گا کہ رسول کریم ﷺ کا مکی زندگی کا طرز عمل اور تھا اور مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد کا طرز عمل یکسر تبدیل ہو گیا تھا، بلکہ مکی زندگی میں بھی مختلف مراحل میں تبدیلی آتی گئی، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل ہمیں بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم بھی اپنے طرز عمل میں جمود کو ترک کر دیں اور نئے سے نئے اسلوب اور طریقوں کو اپنائیں، کسی ایک ہی طریقے کو لے کر نہ بیٹھ جائیں۔

کیونکہ انسانی طبیعت پانی کی طرح ہے، جب پانی زیادہ عرصے تک کھڑا رہے تو وہ خود بخود خراب ہو جاتا ہے، اس سے بدبو آنے لگتی ہے، اسی طرح انسانی طبیعت درخت کی ہے، جب تک اسے ہوا ملتی رہے اور اس کی شاخیں اور پتے ہلتے رہیں وہ سرسبز و شاداب رہتا ہے، لیکن اگر اسے چاروں طرف سے ہوا بند کر دیا جائے تو وہ سوکھ جائے گا۔

دعوت الی اللہ کا عمل خود اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے طریقوں اور اسلوب میں وقتاً فوقتاً تبدیلی لائی جاتی رہے، اگرچہ اصل منہج میں تبدیلی ممکن نہیں، لیکن طریقوں میں تبدیلی ممکن بھی ہے اور ضروری بھی، مثال کے طور پر ایک آدمی کسی دور دراز علاقے سے عمرے کے لیے کچھ لوگوں کے ساتھ پیدل سفر کر کے جاتا ہے۔

جب وہ عمرہ ادا کر کے واپس آئے تو وہی لوگ اس سے مطالبہ کریں کہ وہ پھر ان کے ساتھ عمرے کے لیے جائے، کیا یہ شخص فوراً تیار ہو جائے گا جیسے کہ پہلی بار شوق اور چستی سے تیار ہوا تھا؟ لازمی بات ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر دوسرے لوگ اس سے یہ مطالبہ کریں اور یہ لوگ پہلے والے لوگوں سے

اچھے بھی ہوں اور اس بار جانے کا طریقہ بھی مختلف ہو، پہلے پیدل گیا تھا، اب ہوائی جہاز یا کوئی اور مناسب سواری کا بھی انتظام ہو، تو یقینی بات ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ شوق اور رغبت کے ساتھ عمرے کے سفر کے لیے تیار ہو جائے گا۔

اور یہ بات بھی واضح رہے کہ انسان کو اپنی عمر کے تقاضوں کے مطابق اپنے طرز عمل کو بدلنا پڑتا ہے، عمر کے ایک حصے میں ایک کام اس کے لیے مفید اور مناسب ہوتا ہے، لیکن عمر کے اگلے حصے میں ایسا نہیں ہوتا، اس لیے کہ وقت، حالات، عمر، ساتھی اور ماحول، سب بدلتا رہتا ہے۔

اس لیے لازماً ان چیزوں کے بدلنے کے ساتھ اس کا طرز عمل بھی بدلتا ہے، معلوم ہوا کہ انسان کی عمر اور حالات کے مطابق اس کے اعمال اور طور طریقے بدلتے ہیں، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ایک طرز عمل سے اکتانے اور بیزار ہونے سے پہلے پہلے ہی دوسرا طرز عمل اور طریقہ اپنا لے، کیونکہ جس چیز سے بیزار ہو کر اور اکتاہٹ کی وجہ سے انسان اسے ترک کرتا ہے تو اس کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد وہ اس عمل کو دوسرے طریقے سے بھی کر لے گا تو وہ زیادہ مؤثر نہیں ہوگا۔

دعوت الی اللہ کے طریقے اور صورتیں بے حد و بے شمار ہیں۔ لیکن کوتاہ ہمت اور کمزور ارادے والے لوگ اس وسیع میدان کو اپنی طرف سے تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ایسے ہی جمود کا شکار ہو جاتے ہیں، جیسا کہ پانی سردیوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔

متعدد احادیث سے یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے

دین کی تجدید کے لیے ہر صدی میں ایک مجدد پیدا کیا جاتا ہے، پھر ایک صدی تک دین میں بہت سی غلط باتیں داخل ہو جاتی ہیں، پھر مجدد آ کر اس کی تجدید کر کے اسے منہج نبوی کے مطابق بناتا ہے، اب آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ تجدید اور تجمید (منجمد کرنا) میں کتنا بڑا فرق ہے۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ دین میں تجدید کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن یہ تجدید اسلوب دعوت اور طریقہ کار میں ہونی چاہیے، نہ کہ اصل دین میں، دین تو مکمل ہے۔

اس میں مزید تجدید کی کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر دین کی طرف دعوت دینے کے طریقہ کار میں بھی تجدید دینی تقاضوں کے مطابق ہو، ایسا نہ ہو کہ دین کی دعوت کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو بجائے خود ناجائز ہو، تو ناجائز طریقے سے دین پھیلنا تو درکنار مزید گمراہی پھیلے گی، باقی دعوت کا میدان وسیع ہے، ہر جائز طریقے اور نئے اسلوب کو استعمال کیا جا سکتا ہے، بلکہ کرنا چاہیے۔

(14) چیلنجز سے عدم واقفیت

دعوت الی اللہ سے وابستہ افراد یا دینی طلبہ کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے کا ایک بڑا سبب خود شناسی سے محرومی ہے، جس کے بعد انسان امت مسلمہ کو درپیش سب سے بڑے چیلنجز سے غافل ہو جاتا ہے جو اس کے داخلی اور خارجی دشمنوں کی جانب سے اسے درپیش ہیں۔ قرآن کریم نے امت مسلمہ کے لیے کئی چیلنجز بیان کیے ہیں، جیسے ایک مقام پر ارشاد ہے:

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

ترجمہ: ''یہود اور نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تم ان کے دین کی اتباع نہ کرو۔'' (سورة البقرة:120)

دوسری جگہ ایک اور چیلنج کا ذکر فرمایا:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا (سورة النساء: 89)

ترجمہ: ''وہ (کفار) دل سے یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر اختیا کرو، جیسے کہ انہوں نے کفر اختیار کیا ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ (سورة النساء 89)

ترجمہ: ''وہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (سورة المنافقون:4)

ترجمہ: ''یہی لوگ (تمہارے) دشمن ہیں، لہٰذا ان سے بچا کرو۔''

ایک اور مقام پر مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کی جانب سے درپیش چیلنج کا ذکر فرمایا:

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (سورۃ النساء102)

ترجمہ: ''کافر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں۔''

ان آیات میں مسلمان کو اس کے دشمن کی جانب سے درپیش خطرات اور چیلنجز کا ذکر کیا گیا ہے، جب انسان اپنے دشمن کی جانب سے درپیش خطرات اور چیلنجز سے واقف ہوگا تو وہ ہمیشہ ہوشیار رہے گا، ان چیلنجز سے نمٹنے کیلئے وہ ہر وقت چست اور چاق و چوبند رہے گا، لیکن جب وہ ان خطرات سے غافل ہوگا تو اس کی دینی زندگی اور دعوت کا کام متاثر ہو جائے گا۔

وہ ہر وقت آرام پسندی اور سونے کا عادی ہو جائے گا، بلکہ زیادہ غفلت کی وجہ سے دشمن کو موقع مل جائے گا اور وہ اس کا صفایا کر کے رکھ دے گا۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (سورۃ البقرۃ: 195)

ترجمہ: ''اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو۔''

مذکورہ آیت کا شانِ نزول

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے یعنی انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انصار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپ کر آپس میں مشورہ

کیا کہ اب اللہ نے اپنے دین کو غلبہ عطا فرمایا ہے، اس کی مدد و نصرت کرنے والے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

اب ہمیں اپنے ان اموال کی طرف توجہ دے کر انہیں بنانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جو اسلام لانے کے بعد متاثر ہوئے ہیں، یعنی جہاد کے بجائے اپنے باغات اور تجارت وغیرہ پر توجہ دینی چاہیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس ارادے کی نفی کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ

ترجمہ: ''اللہ کے راستے (جہاد میں) خرچ کیا کرو، اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو۔'' (سورۃ البقرۃ: 195)

اس حکم کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ زندگی بھر جہاد کرتے رہے اور اسی راستے میں یورپ کی سرزمین پر وہ شہید ہو گئے اور ان کی قبر بھی ترکی میں ہے۔ (الطبری: 204/2)

اہر بات ہے کہ دنیا کی جو بھی حکومت اپنی سرحدات کو غیر محفوظ سمجھتی ہے تو وہ اپنی فوجوں کو سرحدات کی طرف بھگاتی ہے، تاکہ خطرہ کا مقابلہ کیا جاسکے، بلکہ یہ حس حیوانات میں بھی ہے کہ وہ خطرے کے نمٹنے کے لیے اپنی تمام تر قوتیں بروکار لاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، پھر جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو اپنی سابقہ حالت پر آجاتے ہیں، عربی میں مشہور مثال ہے کہ

لو ترك القطا ليلا نام

''یعنی اگر رات کو قطا پرندے کو چھوڑ دیا جائے تو وہ سو جاتا ہے۔''

لیکن جب بھی اسے خطرے کا احساس ہو تو اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔ مسلمان کی

مثال بھی ایسی ہی ہے، اگر اسے درپیش چیلنجز اور خطرات کا ادراک ہو جائے تو وہ کبھی بھی سستی و کاہلی اور بے حسی کا شکار نہیں ہوگا، لیکن اگر اس سے یہ احساس ختم ہو جائے تو خود بخود سستی و کاہلی اس کے اعصاب پر قابض ہو جائے گی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کے گھر کے آس پاس چور منڈلا رہا ہو تو آپ کی نیند اڑ جاتی ہے، لیکن چور تو دنیا کی کوئی معمولی سی چیز لے جائے گا۔

لیکن دین کے چوروں کے بارے میں آپ کو زیادہ فکر ہونا چاہیے جو دولت ایمان کو چرانے کے درپے ہیں، اگر آپ نے غفلت کا مظاہرہ کیا تو وہ اس متاع بے بہا کو اچک کر لے جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ خطرے کو خطرہ نہ سمجھنا یا اس سے آنکھیں بند کرنا بھی انسان کو سستی و کاہلی اور بے حسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

(15) کمزور تربیت

مسلمان کو ایک طویل تربیت کی ضرورت ہے، جو زندگی کے ہر پہلو کو شامل ہو، عملی تربیت بھی ہونی چاہیے اور علمی تربیت بھی ہونی چاہیے۔

رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہترین طریقے سے تربیت فرمائی تھی، جس کا اپنے پرائے سب معترف ہیں۔ لیکن اس طرح کی تربیت کوئی آسان اور معمولی چیز نہیں تھی، بلکہ اس میں کئی سال کا عرصہ لگا ہے، تیرہ سال مکہ مکرمہ میں تربیت کرتے رہے، پھر دس سال مدینہ طیبہ میں بھی مسلسل تربیت فرماتے رہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی، آپ ایک ایک بات انہیں سمجھا رہے تھے۔

تربیت کا کام بہت محنت طلب ہے، جس میں مسلسل کئی سال لگ سکتے ہیں، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت ہوئی، جو آپ کے ہاتھوں سے تربیت پا کر دنیا میں ستارے کی طرح چمکتے رہے اور جہاں گئے، ہدایت کا ذریعہ بن گئے۔

ان کی مثال پیش کرنے سے تاریخ انسانی قاصر ہے، اسی تربیت کے بعد وہ مصائب و آلام کے پہاڑوں سے ٹکرائے اور سرخرو ہو کر نکلے، اللہ کے راستے میں انہیں جو بھی مشکل پیش آئی، خندہ پیشانی سے اسے قبول کر لیا، ذرہ برابر بھی نہ جھکے اور نہ بکے اور نہ ہی کسی مرحلے میں کمزوری کا مظاہرہ کیا۔

امت مسلمہ کی نوجوان نسل کو بھی تربیت کی اشد ضرورت ہے اور وہ تربیت بھی قرآن و سنت کے بتائے ہوئے اصولوں اور سلف صالحین کے طریقے پر ممکن ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارے زمانے میں امت کے مردوں خصوصاً نوجوان لڑکوں کی تربیت بہت کمزور ہو چکی ہے، بلکہ عورتوں کی دینی تربیت بھی نہ ہونے کے برابر ہے، مغرب نوازی کا ایسا طوفان برپا ہے جس کی رو میں نوجوان نسل بہتی چلی جارہی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق کمزور ہے، علم دین کا فقدان ہے، تجربہ نہیں ہے، سب دنیاوی آسائشوں اور راحت کے سامان کی طرف ایسے بھاگے جارہے ہیں کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ اس کی منزل کہاں ہے، سب سراب کو پانی سمجھ کر اور دھوکے کو حقیقت سمجھ کر دنیا کی محنت میں مگن ہیں، مگر وہ تھوڑے سے ہی افراد ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس طوفان بلا سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

جب اولاد کی تربیت نہیں ہوگی تو وہ کسی بھی آزمائش اور امتحان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے زمانے میں دین پر استقامت نہ ہونے کے برابر ہے، جس شخص کی تربیت نہ ہو دینی امور کے حوالے سے وہ لازماً سستی وکاہلی کا شکار ہوجائے گا، اس لیے اس سلسلے میں محنت کی ضرورت ہے۔

علمائے دین اور مرشدین ومربین کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوان نسل پر توجہ دیں، ورنہ وہ وقت آنے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہ ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی، اس وقت کف افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اولاد کی تربیت کے حوالے سے چند اہم نکات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

اولاد کی تربیت کا بنیادی مرحلہ

(الف) اولاد کی تربیت کے حوالے سے اکثر لوگ ابتدا میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جب بچہ کوئی غلط کام کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، بچہ ہے، ناسمجھ ہے، بڑا ہو کر خود چھوڑ دے گا۔

لیکن بڑا ہوتے ہوتے بری عادت اس کی طبیعت کا حصہ بن جائے گی اور پھر عادت کو چھوڑنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے، اس لیے اولاد کی تربیت کے سلسلے میں ابتدا ہی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اولاد کو بری عادت میں پڑنے سے پہلے ہی دور رکھا جائے

(ب) تربیت کے سلسلے میں اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی بری عادت میں پڑنے سے پہلے ہی اولاد کو اس سے دور رکھا جائے، بعض لوگ اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ بچہ کوئی غلطی کرے تو اسے متنبہ کرتے ہیں، اس سے پہلے اس کے اخلاق و کردار کی اصلاح پر کوئی توجہ نہیں دیتے، حالانکہ کسی مرض میں مبتلا ہو کر علاج کرنے سے بہتر یہ ہے کہ پہلے سے پرہیز کیا جائے تا کہ وہ مرض لاحق ہی نہ ہو۔

ثواب و گناہ پر اولاد کے یقین کی کمزوری کی تربیت کرنا

(ج): ثواب وعقاب پر یقین کی کمزوری بھی تربیت پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے اس اعتقاد کو مضبوط بنانے کی اشد ضرورت ہے، بچپن سے ہی اولاد کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ گناہ پر اللہ تعالیٰ سخت سزا دے گا اور نیکی پر بیش قیمت نعمتوں سے نوازے گا۔

معمولی سی کوتاہی پر اولاد کو جسمانی یا ذہنی سزا دینے کی غلطی

(د) بعض لوگ معمولی سی کوتاہی پر بھی اولاد کی سخت سرزنش کرتے ہیں اور انہیں جسمانی یا ذہنی سزا دیتے ہیں اور ان کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اولاد کو ہمیشہ تکلیف دیتے رہتے ہیں، بسا اوقات کسی غلطی پر ان کے دوستوں کے سامنے انہیں ذلیل کرتے ہیں یا سب لوگوں کے سامنے انہیں سزا دیتے ہیں، اس طرز عمل کے تربیت پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس طرح تربیت کرنے سے اولاد بنے کے بجائے اور بگڑے گی۔

اولاد پر ان کی حیثیت سے بڑھ کر ذمہ داری ڈالنا

(ھ) بعض لوگ اولاد کی تربیت کے مکمل ہونے سے پہلے ان پر بھاری ذمہ داری ڈالتے ہیں، ان کی عمر اور صلاحیت سے بڑھ کر کوئی کام ان کے ذمہ لگاتے ہیں، یہ انتہائی منفی طرز عمل ہے، اس کے جلد یا بدیر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔

(16) عمل اور فطری صلاحیت میں مطابقت نہ ہونا

ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے مختلف کام کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، کسی کے اندر ایک کام کی اچھی صلاحیت ہے تو دوسرے کے اندر کسی اور کام کے کرنے کی اچھی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ ہر انسان ہر کام اچھی طرح نہیں کرسکتا اور نہ اس کی طبیعت و فطرت ہر عمل کے موافق ہوتی ہے، یہ ایک فطری وقدرتی نظام ہے۔

اس لیے اپنی زندگی کے لیے کوئی عمل اور ہدف مقرر کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ انسان کا منتخب کردہ عمل اس کی خداداد فطری صلاحیت کے موافق اور مطابق ہو، لیکن بعض لوگ ایسے کاموں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی فطری صلاحیت سے میل نہیں کھاتے اور وہ کام اس کی طبیعت کے مخالف ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک آدمی کتابت کا فن سیکھنا چاہتا ہے اور اس کی مشق کرتا ہے اور بھرپور اس میں محنت کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں سیکھ پاتا، اسی طرح ایک شخص خطابت کا فن سیکھنے میں محنت اور جدوجہد کرتا ہے، لیکن نہیں سیکھ پاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے جس کام کا انتخاب کیا وہ اس کی فطری صلاحیت اور خداداد قابلیت کے مخالف ہے، اس کے اندر اس چیز میں مہارت حاصل کرنے کا ملکہ ہی نہیں رکھا گیا ہے۔

اپنی طبیعت کے خلاف امور کو اپنانے کے بعد انسان کے اندر فطری صلاحیت اور اس عمل کے درمیان ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے، جس کے بعد آہستہ آہستہ اس فطری صلاحیت اور طبیعت غالب آجاتی ہے اور وہ عمل اسے بھاری محسوس ہونے لگتا ہے۔

بسا اوقات انسان اپنی فطری صلاحیت کے خلاف عمل کے لیے اتنی محنت کرتا ہے

کہ اس کی ساری توجہ اسی پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے اہم امور سے غافل ہو جاتا ہے، جیسے کہ اس کی پڑھائی اور امتحانات کی تیاری بھی متاثر ہو جاتی ہے۔

اس کا انجام یہ ہوگا کہ فطری صلاحیت جو کہ اصل ہے، منتخب کردہ عمل پر غالب آجائے گی، کیونکہ وہ اس انسان کے لیے اصل نہیں، بلکہ اپنے نفس کو مجبور کر کے اسے منتخب کیا تھا، اس لیے آخر کار نفس اس سے بیزار ہو جائے گا اور تھکاوٹ و سستی کا شکار ہو جائے گا اور وہ عمل یوں ادھورا رہ جائے گا۔

دین کا کام اور دعوت کے طریقے محدود نہیں ہیں، یہ میدان بہت وسیع ہے، اس لیے اگر کوئی ایک طریقہ اور کام انسان کی فطری صلاحیت اور اس کی طبیعت کے ساتھ موافق نہیں ہے، تو کوئی دوسرا طریقہ اپنا لے، جو اس کی طبیعت کے موافق ہو، اپنی عمر اور وقت کو ایک لاحاصل چیز پر ضائع نہ کرے، یہی بات کسی شاعر نے اس شعر میں بیان کی ہے۔

اذا لم تستطع شيئا فدعه و جاوزه الى ما تستطيع

ترجمہ: ”جو کام آپ کر نہیں سکتے، اسے چھوڑ دیں، اس کے بجائے وہ کام کریں، جو آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

ہاں البتہ وقتی طور پر کوئی ایسا عمل کیا جا سکتا ہے جو انسان کی طبیعت اور فطرت کے موافق نہ ہو، لیکن ایسا کام ہمیشہ کرنا یعنی اسے اپنی زندگی کا ہدف اور پیشہ بنانا بے کار ہے، اس کے نتیجہ سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ بھی نہیں نکلے گا، اس لیے کہ اس نے اپنے نفس پر ایک ایسی ذمہ داری لگائی ہے جو اس کی قدرت سے باہر ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (سورة البقرة:286)

ترجمہ: ''اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔''

اسی طرح محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

عليكم بما تطيقون (صحیح بخاری: کتاب الایمان)

ترجمہ: ''تم پر وہ کام کرنا لازم ہے جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔''

اس ساری تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ والدین کو اپنی اولاد کی فطری صلاحیتوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور وہ اپنی اولاد کو اسی کام پر لگادیں جو ان کی طبیعت کے موافق ہو، اسی طرح علماء و مربی حضرات کو بھی شروع سے اپنے طلبہ کی طبیعت اور فطری صلاحیت کو پرکھنا چاہیے، تاکہ ان سے ایسے علوم وفنون پر زیادہ محنت کرائی جائے جو ان کی طبیعت کے موافق ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہوئے بھی ان پر ایسے ہی اعمال لازم کردیئے جائیں۔

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے پسندیدہ فن میں مہارت حاصل کریں گے، بلکہ محقق بن جائیں گے اور اس مقام تک پہنچ جائیں گے، جو ان کے اساتذہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا۔ لیکن بہت سے علماء اس چیز کا خیال نہیں رکھتے، وہ اپنے طلبہ کو ایسے کام پر لگادیتے ہیں۔

جو ان کی طبیعتؔ کے یکسر خلاف ہوتا ہے اور طالب علم شرم کی وجہ سے استاذ کو بتا نہیں سکتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ طالب علم اس کام کو اپنے لئے بوجھ محسوس کرتا ہے، اس میں دلچسپی اور رغبت کا اظہار نہیں کرتا۔ پھر آخر کار سستی وکاہلی کا شکار ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔

اس لئے اساتذہ اور علماء ومربین کو چاہیے کہ وہ ابتدا ہی سے اپنے شاگردوں اور طالب علموں کی فطری صلاحیتوں کو پرکھنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ ان کی اسی نہج پر تربیت کرسکیں اور انہیں وہی فن وعلم پڑھائیں، جوان کی فطری صلاحیت کے مطابق ہے، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ طالب علم اس فن کو خوب شوق وذوق سے سیکھے گا اور اس میں مہارت حاصل کرے گا۔

بلکہ وہ اس فن میں موجد بن کر ابھرے گا، یہ کام استاذ کو خود کرنا چاہیے، اس لیے کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے شرم وحیا کی وجہ سے اپنے مافی الضمیر اور خواہش کا خود اظہار نہیں کرسکتے، جس سے پھر بعد میں نقصان ہوتا ہے۔

یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فطری صلاحیت کی کمزوری کو کوشش اور جہد مسلسل سے پورا کیا جانا ممکن ہے

(الف) طلبہ کی ذہنی صلاحیت اور فطری استعداد کی کمزوری اور نقص کو محنت، کوشش، تعلیم اور مسلسل مشق کے ذریعے پورا کیا جاسکتا ہے، اگرچہ اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا، لیکن یہ کام ناممکن ہے، مشق ومحنت اور تعلیم وتربیت کے بعد فطری صلاحیت کے خلاف کام کا بھی انسان عادی ہو جائے گا، بلکہ وہ اس کی فطرت وطبیعت کا حصہ بن جائے گا اور وہ خود اس کام کو دل لگا کر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

اس لیے اس حوالے سے بالکل مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ فلاں کام میری فطری صلاحیت کے خلاف ہے، میں اسے کر ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

فرائض ضروریہ فطری صلاحیت کے تابع نہیں

(ب): جن امور اور افعال کا ہم نے ذکر کیا، ان کا تعلق مستحبات اور فرائض کفایہ سے ہے، باقی جو فرض عین امور ہیں، انہیں ہر حال میں کرنا ہی ہے، اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ کام میری فطری صلاحیت کے موافق ہو تو کروں گا، نہ ہو تو نہیں کروں گا، فرض عین امور کو ہر حال میں انجام دینا ہی ہے، ہاں کوئی شرعی عذر درپیش ہو تو وہ الگ بات ہے۔

(17) ماحول کا مختلف ہونا

بعض داعیوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ وہ ہر ماحول اور ہر قسم کے اجتماع میں دین کی دعوت احسن طریقے سے دے سکتے ہیں، وہ ہر ماحول، وقت اور لوگوں کی حالت کے موافق گفتگو کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں، ان کا علم وسیع، تجربہ طویل اور نفسیات پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔

اس عنوان کے تحت ہم جو گفتگو کرنے جارہے ہیں، اس میں ہم اِن حضرات کی بات نہیں کریں گے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ لیکن ہر شخص ایسا نہیں ہوسکتا۔

ہماری گفتگو کا محور عام لوگ ہیں، جو ایک خاص ماحول میں تو اچھی طرح کام اور گفتگو کرسکتے ہیں لیکن اگر دوسرے کسی ماحول میں چلے جائیں تو اس طرح کام اور گفتگو نہیں کر پاتے، انہیں ایک خاص قسم کے اجتماع اور ماحول میں گفتگو کرنے کی مہارت ہوتی ہے، لیکن جب اس ماحول سے چلے جائیں تو وہ بدل جاتے ہیں۔

کچھ طلبہ ایسے ہوتے ہیں کہ جب اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہ خوب نشاط اور چستی دکھاتے ہیں، لیکن جب وہ دوسرے لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو ان کی فطری صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں، ان کی ہمت جواب دے جاتی ہے، ان پر سستی وکاہلی چھا جاتی ہے، لیکن اگر وہ پھر سے پہلے والے ماحول میں آجائیں تو ان کی چستی ونشاط اور ہمت پھر سے جوان ہو جاتی ہے۔

ان لوگوں کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو طویل مدت تک اپنے عمل سے

معطل اور دور رہتے ہیں، اس تعطل کے سبب ان کے لیے دوبارہ وہ کام شروع کرنا بہت مشکل لگتا ہے، لیکن اگر وہ اس کام کو شروع بھی کردیں تو پہلے کی طرح چستی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے، اس لیے کہ ماحول اور وقت بدل چکا ہوتا ہے، چنانچہ وہ سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس لیے اگر کسی وجہ سے عارضی طور پر عمل چھوٹ جائے تو جتنی جلدی ممکن ہو سکے دوبارہ اسے شروع کر دینا چاہیے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بالکلیہ طور پر ترک ہو جائے، عارضی تعطل کے باوجود کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دوبارہ شروع کیا جائے، اس لیے اپنے نفس پر بھی محنت کرنی چاہیے، کیونکہ نفس پر یہ کام کافی شاق گزرتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس انسان اور عمل کے درمیان بہت دوری واقع ہو جائے گی اور اس کے دل میں عمل سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔

(18) طویل انتظار اور مدد ومعاون اسباب کی قلت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَ لَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (سورة الحديد: ١٦)

ترجمہ: ''جو لوگ ایمان لے آئے ہیں کیا ان کے لیے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اترا ہے اس کے لیے پسیج جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر ایک لمبی مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور (آج) ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں؟''

اس ارشاد ربانی میں غور فرمائیں تو طول امد یعنی طویل انتظار کا نقصان واضح ہو جائے گا:

جب طویل انتظار کے ساتھ لمبی امیدیں بھی جمع ہو جائیں تو انسان کی مشکلات دوگنی ہو جاتی ہیں، اس کے ارادے اور ہمت پست ہو جاتی ہے، قوت کمزور ہو جاتی ہے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق، لمبی امیدیں باندھنا انسان کی فطرت کا حصہ ہے، چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يزال قلب الكبير شابا في اثنتين في حب المال و طول الامل

(بخاری: کتاب الرقاق، مسلم: کتاب الزكاة)

ترجمہ: ''انسان کے بوڑھا ہونے کے باوجود دو چیزیں جوان رہتی ہیں، ایک

مال کی محبت اور دوسرے لمبی امیدیں۔"

ظاہر بات ہے جب کسی منزل کا راستہ طویل ہو اور اس میں جگہ جگہ طرح طرح کی رکاوٹیں اور مشکلات حائل ہوں تو ہر ایک کی ہمت کمزور ہو جاتی ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ منزل تک پہنچنے میں مدد و معاون اسباب بھی مہیا نہ ہوں، دوست اور ساتھی ہمراہ نہ ہوں، انسان اکیلا ہی اس منزل کی جانب گامزن ہو تو اس کا سفر مشکلات سے پر اور زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا اور وہ اپنا سفر زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکتا اور تھک کر بیٹھ جائے گا۔

اس کا علاج یہ ہے کہ انسان کثرت سے آخرت کو یاد کرے، قبروں کی زیارت کرے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط تر بنالے، ہر وقت موت کے فرشتے کی آمد کا انتظار کرے، نیکیوں میں مدد کرنے والے صالح دوستوں کو تلاش کرے، تو انشاء اللہ وہ نجات پائے گا اور اس مہلک مرض سے اس کی جان چھوٹ جائے گی، وہ دنیا سے لمبی اور جھوٹی امیدوں کے چکر میں کبھی نہیں پڑے گا، انہی امیدوں نے سابقہ امتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ: "(اے پیغمبر!) ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو کہ یہ خوب کھالیں، مزے اڑالیں اور خیالی امیدیں انہیں غفلت میں رکھیں، کیونکہ عنقریب انہیں پتہ چل جائے گا (کہ حقیقت کیا تھی)۔" (سورۃ الحجر: 3)

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

تزود من التقویٰ فانك لا تدری

اذا جن لیل هل تعیش الی الفجر

فکم من سلیم مات من غیر علة

وکم من سقیم عاش حینا من الدهر

وکم من فتی یمسی و یصبح آمنا

و قد نسجت اکفانه و هو لا یدری

ترجمہ: ''تقویٰ کو اپنے لیے زادِ راہ بنالو، اس لیے کہ تمہیں نہیں معلوم کہ جب رات چھا جائے گی تو تم صبح تک زندہ بھی رہو گے یا مردوں میں تمہارا شمار ہوگا، کتنے ہی ایسے لوگ موت کی وادی میں چلے گئے جو جسمانی صحت سے مالا مال تھے اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو بیمار ہونے کے باوجود ایک زمانے تک زندہ رہتے ہیں، کتنے ہی ایسے جوان ہیں جو صحیح وسلامت صبح وشام کرتے ہیں، لیکن ان کے کفن تیار ہو چکے ہیں، مگر انہیں کچھ علم نہیں ہے۔''

اس لئے ہر وقت مسلمان کو اپنے ایمان کی تجدید اور نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اور موت کے بعد آنے والی زندگی اور سخت ترین منزلوں کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے، اس راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر کامل بھروسہ ہونا چاہیے، اسی سے تمام مشکلات اور رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔

رسول کریم ﷺ نے قرآن کریم میں مذکور حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کے حوالے سے فرمایا تھا جو انہوں نے اپنی امت کے سامنے بے بس ہو کر کہا تھا: ''کاش کہ میں کسی طاقتور ہستی کی پناہ میں ہوتا'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے، جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے تو آپ علیہ السلام سب سے طاقتور ہستی (اللہ تعالیٰ) کی پناہ میں تھے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی مبعوث فرمایا، اس کے پشت پر اس کی قوم کا ایک مضبوط سہارا بھی کھڑا کر دیا۔''

(تفسیر طبری:87/13)

چونکہ لوط علیہ السلام کو جس قوم کی طرف بھیجا گیا تھا، وہ ان کی اپنی قوم نہیں تھی، اس لیے انہوں نے قوم کو مضبوط سہارا قرار دے کر اس کی پناہ میں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

(19) وساوس واوہام

انسان کے عمل کو تباہ کرنے والے اسباب اور اسے سستی وکاہلی میں مبتلا کرنے والے عوامل میں سے ایک وسوسہ اور وہم بھی ہے۔

انسان کے دل میں وہم وسوسہ ڈالنے میں شیطان مردود کو کمال حاصل ہے، بلکہ یوں کہیے کہ یہی شیطان کا میدان عمل اور زندگی کا مقصد اصلی ہے، جیسے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

الحمد لله الذی رد کیده الی الوسوسة (ابو داؤد، کتاب الادب)

ترجمہ: ''تمام تعریف اس اللہ کے لیے جس نے شیطان کو مکر وفریب و وسوسے کی حد تک محدود فرمایا ہے۔''

یعنی شیطان دل میں وسوسہ ہی ڈال سکتا ہے، اس سے آگے مزید کچھ نہیں کرسکتا کہ انسان کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کوئی کام کرائے، یہ طاقت اللہ تعالیٰ نے اس مردود کو نہیں دی ہے۔

شیطان مردود جب دل میں وسوسہ ڈالتا ہے تو انسان اس کے جال میں پھنس جاتا ہے، بہت سے ایسے لوگ جو دین کی دعوت کا کام بڑی چستی اور تندہی سے سرانجام دیا کرتے تھے اور ان کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر بھی رکھی تھی، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ وسوسوں اور اوہام کا شکار ہو گئے۔

جس کے بعد ان کی سوچ بٹ گئی، فکر متزلزل ہوگئی، کبھی وہ اپنی اولاد کے حوالے سے وسوسوں کا شکار ہو گئے اور دل میں سوچنے لگے کہ ہم دین کے کاموں میں لگے

رہے تو ہمارے بعد اولاد کا کیا بنے گا؟ اس لیے جوانی میں ان کے لیے کچھ سرمایہ جمع کرنا چاہیے۔ اور کبھی ان حضرات کو قید و بند کا انجانا خوف لاحق ہو گیا کہ ہم دین کی بات کریں گے تو حکومت جیل میں ڈالے گی۔

جس کے بعد ہمارا کیا بنے گا، بعض حضرات اپنی ملازمت کے خوف سے دینی کاموں سے دستبردار ہو گئے کہ جناب! اس سے کہیں ایسا نہ ہو کہ حکام ناراض ہو جائیں اور ہماری ملازمت جاتی رہے۔ یوں وسوسوں اور اوہام کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور وہ اچھے خاصے داعی اور دین کے کام کرنے والے کسی کام کے نہیں رہے۔

یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ شیطانی وساوس و اوہام کو اگر لگام نہ دی جائے اور انہیں اپنے دل پر جگہ دے کر اپنے اوپر سوار کیا جائے تو یہ عمل کی حد تک محدود نہیں رہتے، بلکہ آہستہ آہستہ عقیدہ بھی خراب ہو جاتا ہے اور انسان مخلوق سے ایسا ہی ڈرنے لگتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں شیطانی وساوس کا ذکر فرمایا ہے، چند آیات کریمہ پر غور و فکر کریں تو بات آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی۔

و یخوفونك بالذین من دونه (سورة الزمر: 36)

ترجمہ: یہ تمہیں اس (اللہ تعالیٰ) کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں۔"

انما ذلكم الشیطن یخوف اولیاء ه فلا تخافو هم و خافون ان کنتم مومنین (سورة آل عمران: 175)

ترجمہ: درحقیقت یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، لہٰذا تم اگر مومن ہو تو ان سے خوف نہ کھاؤ اور بس میرا خوف رکھو۔"

وسوسوں سے بچنے کا مجرب نسخہ اور علاج

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

ترجمہ: ''کہو کہ: میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی، سب لوگوں کے بادشاہ کی، سب لوگوں کے معبود کی، اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، چاہے وہ جنات میں سے ہو، یا انسانوں میں سے۔'' (سورۃ الناس)

سورۃ الناس شیطانی وسوسوں اور اوہام کے لیے مجرب علاج اور نسخہ کیمیا ہے، بشرطیکہ انسان خود بھی وسوسوں کو لگام دینے کی کوشش کرے اور اوہام کی وجہ سے کسی عمل کو ترک کرنے کی عادت نہ اپنائے، شیطان کی طرف سے دل میں آنے والے وسوسے محض خیال ہوتے ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، شیطان اس جال میں انسان کو پھنسا کر نیک عمل سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

اس لیے ان پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے، جب بھی دل میں کوئی شیطانی وسوسہ آئے تو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ کسی بھی حوالے سے دل میں وسوسہ آئے تو فوراً اس کے برعکس سوچنا چاہیے۔ جیسے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مشہور فرمان ہے:

اطلبوا الموت توهب لكم الحياة

ترجمہ: ''تم موت مانگو تو تمہیں زندگی مل جائے گی۔''

شیطانی وسوسوں کی وجہ سے انسانی سستی و کاہلی کا شکار ہو کر اعمال صالحہ سے دور ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج بھی بتایا ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (سورۃ الاعراف: 201)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، انہیں جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آ کر چھوتا بھی ہے تو وہ (اللہ کو) یاد کر لیتے ہیں، چنانچہ اچانک ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔''

(20) سستی و کاہلی کے دیگر اسباب

مذکورہ بالا بیس اسباب کے علاوہ سستی و کاہلی کے کچھ اور اسباب بھی ہیں، جنہیں ہم اس عنوان کے تحت مختصراً ذکر کریں گے، ان اسباب وعوامل میں کچھ تو زیادہ اثر انگیز ہیں اور کچھ کی تاثیر اس سے کم ہے۔ ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے، تاہم طلبہ اور داعی حضرات کے لیے اختصار کے ساتھ ان اسباب پر روشنی ڈالیں گے اور محض اشارے پر اکتفا کریں گے، عاقل کے لیے اشارہ ہی کافی ہوا کرتا ہے۔

(الف) دل کی بیماریاں

دل کی مختلف بیماریاں ہوتی ہیں، جیسے کہ حسد، کینہ، بغض، عداوت، بدگمانی، عصبیت اور تعصب وغیرہ۔ ان بیماریوں میں سے کچھ تو زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں جبکہ بعض کی ہلاکت خیزی کچھ کم ہے، جیسے کہ تعصب ایک مہلک باطنی بیماری ہے، جس سے مزید کئی امراض جنم لیتے ہیں، یوں انسانی دل بیماریوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کا باطن کتنا گندا ہو چکا ہے۔

جب دل اس قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جائے تو وہ خالق سے مخلوق کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس کے اندر خیالات و جذبات اور تمناؤں اور آرزؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، وہ اپنے ہی من میں کھو جاتا ہے، دوسروں کو بھول جاتا ہے، بلکہ اپنی خوشی اور فائدے کے لیے دوسروں کے نقصان کے درپے ہوتا ہے، حسد اور تعصب کی وجہ سے وہ اپنے مسلمان بھائی کے نقصان پر خوش اور فائدے پر غمگین ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے اسی پس منظر میں کہا ہے کہ

اصبر علی مضض الحسود

فان صبرك قاتله

النار تأكل بعضها

ان لم تجد ما تأكله

ترجمہ: حاسد کی تکلیفوں پر صبر کر، اس لیے کہ تیرا صبر کرنا اس کے لیے زہر قاتل کی طرح ہے، آگ کو جلانے کی کوئی اور چیز نہ ملے تو وہ خود کو کھا جاتی ہے۔ یعنی حاسد بھی اپنے حسد کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا، تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

(ب) شہوتِ خفی (دل میں پوشیدہ خواہش)

اس مرض میں تقریباً سبھی لوگ مبتلا ہیں، مگر جسے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بچانا چاہے وہی بچ سکتا ہے، ایک شخص ابتدا میں خالص اللہ کی رضا کے لیے دین کی تعلیم حاصل کرتا ہے، جس کے بعد اسے اچھا خاصا علم بھی حاصل ہوتا ہے، اس سے علم سیکھنے کے لیے کافی تعداد میں لوگ بھی اس کے پاس آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس کی علمی صلاحیت اور فصاحت و بلاغت اور طرز تکلم سے وہ متاثر ہو جاتے ہیں، یہ سارا کچھ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کر رہا ہوتا ہے، لیکن اس دوران شیطان خفیہ طور پر اپنا وار کر گزرتا ہے، اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہر وقت لوگ میری خدمت میں حاضر رہیں، میری بات سنیں اور میرا کہنا مانیں، یوں اس کے دل میں بڑا بننے کا شوق کروٹ لینے لگتا ہے۔

جس کے بعد اس کے دل میں دنیا اور اس کے زیب و زینت کی محبت پیدا ہوتی

ہے، اب وہ ہر ایک سے اپنی تعریف سننے کا متمنی ہوتا ہے، ہر محفل کی رونق اور ہر مجلس کی زینت بننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے لیے اونچے اونچے القاب اور تعریفی کلمات سن کر خوش ہوتا ہے، یہی دل میں وہ خفیہ شہوت یا پوشیدہ خواہش ہے، جو ایک مخلص انسان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے، اسی خفیہ شہوت سے متعلق رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے:

هو الرجل يتعلم العلم يحب ان يجلس اليه

(ابن عبد البر، جامع بيان العلم و فضله)

ترجمہ: ''(دل میں پوشیدہ خواہش یا شہوت رکھنے والا) وہی شخص ہے، جو اس لیے علم حاصل کرتا ہے کہ اسے یہ بات پسند ہے کہ لوگ اس کے سامنے (عاجزی سے) بیٹھ جایا کریں (جیسے کہ طالب علم اساتذہ کے سامنے بیٹھتے ہیں)۔''

اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، جس شخص کی یہ حالت ہو جائے تو لازمی بات ہے کہ وہ نیکیوں کے میدان میں سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا، وہ چونکہ ہر کام میں اپنی واہ واہ اور تعریف سننے کا عادی ہے، اس لیے اکیلے میں کوئی کام نہیں کر پائے گا، اس کا تعلق خالق سے کٹ کر مخلوق سے جڑ جائے گا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا

(سورة القصص: 83)

ترجمہ: ''وہ آخرت والا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں نہ تو بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد۔''

(ج): عبادت میں کوتاہی

یہ بھی سستی وکاہلی کا ایک سبب ہے، خاص کر کے انسان دن رات کے معمولات اور وظائف میں کوتاہی برتتے ،نوافل کا اہتمام نہ کرے، سنن مؤکدہ کا زیادہ خیال نہ رکھے، کئی کئی دن تک قرآن کریم کی تلاوت نہ کرے تو لازمی بات ہے کہ سستی وکاہلی اس کے رگ وپے میں پیوست ہوجائے گی، تلاوت نہ کرنے کے بارے میں خود رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے:

والذی لیس فی جوفه شیء من القرآن كالبيت الخرب

ترجمہ: ''جس شخص کے دل میں قرآن کریم کا کوئی حصہ محفوظ نہ ہوتو ایسا دل ویران گھر کی طرح ہے۔'' (جامع الترمذی: کتاب فضائل القرآن)

حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فجر کی نماز کے بعد چاشت کے وقت تک اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ میرا ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میرے قویٰ اور صلاحیتیں متاثر ہوجائیں گی۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا يا جرير المجامع

(د) تعصب اور گروہ بندی

بعض لوگ کسی جماعت یا پارٹی سے وابستہ ہوتے ہیں اور اس جماعت کے علاوہ دوسری جماعتوں سے وابستہ علماء وصلحاء اور مسلمانوں کے لئے ان کے دلی جذبات کچھ اچھے نہیں ہوتے، بسا اوقات وہ اس میں غلو سے بھی کام لیتے ہیں اور شرعاً ناجائز امور کا

ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، جیسے مخالفین کی غیبت، ان سے بدظنی، ان کے عیوب کی پردہ دری اور ان پر الزام تراشی وغیرہ ناجائز امور دیکھنے میں آتے ہیں، حالانکہ اپنی جماعت کی محبت میں انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں یا کیا کر رہے ہیں۔

جماعت سے محبت کی وجہ سے وہ ایسے امور کو جائز بلکہ کار ثواب سمجھتے ہیں، یوں دن بہ دن ان کا غلو بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ اسی ڈگر سے زندگی کا ایک طویل حصہ گزار دیتے ہیں، جب پل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا ہوتا ہے تو پھر انہیں احساس ہوتا ہے، لیکن ''اب کیا پچھتائے ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' کے مصداق کوئی فائدہ نہیں۔

اس جماعتی تعصب اور غلو کی وجہ سے وہ جوانی کی زندگی میں کوئی نیکیوں کا ذخیرہ جمع کرنے کے بجائے فضولیات میں مشغول رہا ہے، بلکہ ثواب سمجھ کر گناہ کماتا رہا ہے، اس لیے جب احساس زیاں ہو جائے تو اس وقت بھی تلافی کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

ایسے شخص کو چاہیے کہ سابقہ زندگی پر ندامت کا اظہار کر کے خالص توبہ کرے اور ان لوگوں سے معافی مانگے، جن کی غیبت کی ہے، یا انہیں نقصان پہنچایا ہے، ویسے جماعتی تعصب کے شکار آدمی کو زندگی بھر اپنے کرتوتوں پر احساس ندامت نہیں ہوتا، لیکن عمر کے کسی مرحلے میں بھی یہ احساس ہو جائے تو اسے غنیمت اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سمجھتے ہوئے باقی ماندہ زندگی سے فائدہ اٹھائے۔

توبہ کرے اور اب بقیہ زندگی میں نیک اعمال کا اہتمام کرے، اس لیے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

واتبع السيئة الحسنة تمحها و خالق الناس بخلق حسن

ترجمہ: ’’برائی کے پیچھے نیکی کیا کر، تا کہ وہ برائی کو مٹادے، اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کر۔‘‘ (ترمذی شریف، کتاب البر و الصلة)

(ھ) خود کو ہوشیار سمجھ کر نصیحت پر کان نہ دھرنا

یہ بھی نیک اعمال سے دور لے جانے والا اور اس میدان میں انسان کو سستی و کاہلی میں مبتلا کرنے والا طرز عمل ہے، یہ سابقہ سبب جیسا ہی ہے، تاہم ان میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے، سابقہ سبب خاص ہے کہ اس کا تعلق صرف جماعتی تعصب کے ساتھ ہے، لیکن یہ عام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہوشیار، مہذب اور متمدن سمجھ کر دوسروں کی نصیحت اور اچھی باتوں پر کان نہ دھرے، چاہے وہ کسی جماعت سے وابستہ ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ خود فریبی کا شکار ہے۔

اپنے آپ کو عقل کل اور اپنی بات کو ہی حرف آخر سمجھتا ہے، دوسروں کو جاہل، نادان یا ناتجربہ کار کہہ کر ان کی ہر بات کو ٹھکرائے گا، جب کسی کے دماغ پر یہ چیز سوار ہوجائے تو وہ نصیحت اور دین کی باتوں پر کیسے کان دھرے گا، اس لیے شروع میں ہی اس بیماری کے علاج کی ضرورت ہے، ورنہ اس کا سلسلہ طویل تر بھی ہوسکتا ہے۔

جس کا انجام بہت بھیانک ہوگا، ایسا شخص شروع میں تو والدین، بزرگوں، صلحاء اور علماء کی بات نہیں مانے گا، پھر آگے چل کر وہ اپنے ضمیر کو اللہ و رسول ﷺ کی بات ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کر پائے گا۔ اس کے سر پر خود فریبی و خود پسندی کا خمار جو چڑھا ہوا ہے وہ اس کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے گا۔

(و): اہداف کا غیر یقینی ہونا

کسی بھی کام اور محنت کا ہدف اور ٹارگٹ غیر یقینی ہو، مطلوبہ نتیجہ ملنا مشکل ہو اور اس کے ثمرات کا حصول دور دکھائی دیتا ہو، یا اس کام سے فائدہ بہت کم مل رہا ہو، پھر بھی انسان کسی ایسے کام میں لگا رہے تو وہ جلد یا بدیر سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسے ہمت مل جائے تو ایسے اولوالعزم اور باہمت لوگ اس کام میں لگے رہتے ہیں۔

لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، انسان ضعیف ہے، جب وہ دیکھے گا کہ دن اور مہ وسال گزرتے جا رہے ہیں، لوگ اس کام کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور میں لگا ہوں، حالانکہ مجھے اس کے ثمرات کا ملنا بھی غیر یقینی ہے، یا جو کچھ مل رہا ہے وہ بہت ہی قلیل مقدار میں ہے، تو لازمی بات ہے۔

یہ سوچ کر اس کے اعصاب پر سستی و کاہلی طاری ہو جائے گی، اپنے کام کے بارے میں وہ شک میں پڑ جائے گا اور آہستہ آہستہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور ایک نہ ایک دن وہ اسے خیر باد کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انسانی فطرت کی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نبیوں کو پہلے سے بتایا کہ تمہارے ذمہ لوگوں کو راہ راست پر لانا نہیں، بلکہ صرف تبلیغ کرنا ہے، ورنہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی اور کچھ ہی لوگ آپؑ پر ایمان لے آئے، اپنے دعوتی کام کے ثمرات ونتائج کو دیکھتے تو وہ بھی سست پڑ جاتے کہ میرے اس کام کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل رہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر انبیاء کرام علیہم السلام سے فرمایا:

فهل على الرسل الا البلٰغ المبين (سورة النحل:35)

ترجمہ: ''لیکن پیغمبروں کی ذمہ داری سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ صاف صاف طریقے پر پیغام پہنچادیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰهُمۡ (سورة البقرة:272)

ترجمہ: ''(اے پیغمبر!) ان کافروں کو راہ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔''

حدیث شریف میں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

يأتي النبي و ليس معه احد (مسلم شريف: كتاب الايمان)

ترجمہ: ''قیامت کے دن ایک نبی ایسے بھی آئیں گے، جن کے ساتھ کوئی امتی نہیں ہوگا۔''

معلوم ہوا کہ انبیاء کا ہدف لوگوں کو ہدایت پر لانا نہیں تھا، بلکہ ان کا کام تو دعوت دینا تھا، چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ خلاصہ یہ کہ کسی بھی کام کے مقصد و ہدف اور ثمرات کا واضح اور یقینی ہونا ضروری ہے، ورنہ غیر یقینی ہدف کا پیچھا کرنے والا شخص سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا۔

(ز): ایک پروگرام یا عمل پر عدم استقرار

اس کی طرف اشارہ پہلے بھی ہو چکا ہے، لیکن عام طور پر لوگ اس حوالے سے غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے ہم نے اسے مستقل عنوان کے تحت الگ سے ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ ایک کام شروع

کرتے ہیں اور پھر فوراً ہی اسے چھوڑ دیتے ہیں، خاص کر کے دینی مدارس کے طلبہ میں یہ بیماری عام ہے کہ کسی علم یا فن کو شروع کرتے ہیں اور سے پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی چھوڑ کر دوسرے فن کے پیچھے لگ جاتے ہیں، یا کسی ایک شیخ اور استاذ کے پاس علم حاصل کرنے جاتے ہیں۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد اسے چھوڑ کر کسی اور کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور بسا اوقات وہ مدارس بدلتے رہتے ہیں، ایک سال ایک مدرسے میں، دوسرے سال کسی اور مدرسے میں، حتیٰ کہ بعض طلبہ ایک تعلیمی سال کے دوران کئی کئی مدارس بدلتے ہیں۔اس بری عادت کی مثال ایسی ہی ہے۔

جیسے کہ ایک پودا ہے، اسے آپ نے ایک جگہ بویا، کچھ ہی دن یا مہینے بعد وہاں سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگا دیا، کچھ عرصے بعد کسی اور جگہ کا انتخاب کیا، یوں وہ پودا ہمیشہ پودا ہی رہے گا، چاہے سو سال گزر جائیں وہ کبھی تناور درخت نہیں بن سکتا۔تو عدم استقرار کا شکار لوگ بھی ایسے ہیں، وہ کبھی کچھ حاصل نہیں کر سکتے، وہ نہ سفر میں ہیں نہ حضر میں، نہ قافلے کے ساتھ ہیں اور نہ گھر والوں کے ساتھ۔انجام کار وہ تھک کر ہمت ہار بیٹھیں گے اور ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

اس مرض کا بنیادی سبب عزم وارادے کی کمزوری ہے، لازمی بات ہے جس کے ارادے پختہ ہوں وہ کبھی اس طرح بھٹکتا نہیں پھرے گا، وہ جب کوئی کام شروع کرے گا، ابتدا میں معمولی نفع دیکھ کر وہ دلبرداشتہ نہیں ہوگا بلکہ اس کام پر جما رہے گا او رآخر کار اس کام کے ثمرات اور فوائد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص کام شروع کر دے اور فوراً ہی مطلوبہ نتائج حاصل

ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کروڑ پتی بن جائے یا طالب علم فوراً ہی بڑا عالم دین بن جائے، ایسا نہیں ہوسکتا، ثابت قدمی کے ساتھ جم کر محنت کرنے والا شخص ہی بھرپور ثمرات سمیٹتا ہے۔

ایک میدان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف بھاگنا تو منافقین کی خصلت ہے، مسلمان تو ثابت قدم ہوا کرتا ہے۔ جیسے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مثل المنافق مثل الشاة العائرة بين الغنمين، تصير الى هذه مرة و الى هذه مرة لا تدری ايهما تتبع

ترجمہ: ''منافق کی مثال (جفتی کی شوقین) اس بکری کی طرح ہے جو (بکرے کی تلاش میں) کبھی بکریوں کے اُس ریوڑ کا رخ کرتی ہے اور کبھی اِس ریوڑ کا رخ کرتی ہے، وہ نہیں جانتی کہ دونوں میں سے کس کے ساتھ چلے۔'' (مسلم شریف: كتاب صفات المنافقين)

(ح) دینی طلبہ و داعیوں کا باہمی اختلاف

دین کا مبارک کام کرنے والے ان حضرات کے مابین اختلاف ہوجائے تو یہ بھی انہیں اپنے کام سے دور لے جانے اور سستی و کاہلی میں مبتلا کرنے کا بہت بڑا سبب ہے۔ خاص کر کے ہمارے زمانے میں یہ مرض بہت پھیل گیا ہے۔

علماء کرام اور دینی طبقے کے مابین معمولی معمولی باتوں میں شدید اختلافات سامنے آرہے ہیں، بسا اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دونوں جانب کے علماء جس بات میں اختلاف کرتے ہیں، وہ محض اولیٰ اور غیر اولیٰ کا معاملہ ہوتا ہے، مگر

اصحاب علم اپنا سارا روز اسی پر لگاتے ہیں۔

ساری علمی توجہات کا مرکز وہی معمولی مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے، پھر بات اتنی آگے نکل جاتی ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف فتوؤں کا بازار گرم ہوجاتا ہے، جس کے بعد ان کا آپس میں متحد و متفق ہونا کافی مشکل ہوجاتا ہے، پھر وہ علماء کرام اور دعوت دین کے مبارک کام سے منسلک حضرات انہی اختلافی امور کے پیچھے پڑ کر اپنے مقصد اصلی اور دین کی خدمت سے رہ جاتے ہیں اور شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

بسا اوقات دینی طبقے کے اس اختلاف کو دیکھ کر عوام دین سے دور ہوجاتے ہیں، ان کے دل میں دینی طبقے کی نفرت پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فروعی اور غیر اہم مسائل میں اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دین کی خدمت کو مقصد اصلی بنانا چاہیے۔

(ط) شکوک وشبہات اور منافقین کی کارستانیاں:

یہ بھی دین کے راستے کی رکاوٹوں سے ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے سبب انسان دینی کاموں سے دور ہوکر سستی و کاہلی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس لئے اس کے نقصانات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

ظاہر بات ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں منافقین نے مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی کارستانیوں پر خود قرآن کریم شاہد ہے، تو ہمارے زمانے میں بھی منافقین اپنا وجود رکھتے ہیں، وہ الگ بات ہے کہ اس زمانے میں چونکہ وحی کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔

اس لیے کسی شخص کے نفاق باطنی کے بارے میں کسی کو یقینی علم نہیں ہوسکتا، بہر حال منافقین موجود ہیں اور اپنے نشتر چلا رہے ہیں، وہ دینی کام کرنے والوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کر کے انہیں اس مبارک کام سے دور کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

ان کی باتوں میں آکر اچھے خاصے داعی اور دین کا کام کرنے والے حضرات کا ذہن خراب ہوجاتا ہے، وہ اس مبارک کام میں سستی وکاہلی کا شکار ہوجاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ اس کام سے ہی دور ہوجاتے ہیں۔

اس لیے ایسے لوگوں کی باتوں سے بچ کر رہنے کی ضرورت ہے، اگر ان کے کہنے پر کسی کے دل میں کوئی ایسے شکوک پیدا ہوجائیں تو علماء حق کی طرف رجوع کر کے ان کے ازالے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینا چاہیے۔ بلکہ انہیں وہی جواب دینا چاہیے جس کی تعلیم اللہ جل جلالہ نے دی ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے:

حسبنا الله ونعم الوكيل (سورة آل عمران: 173)

ترجمہ: ''ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے، وہی بہترین کارساز ہے۔''

(ی) اللہ تعالیٰ کی سنت سے غفلت

اقوام وافراد کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی سنتیں ہیں، جن کا ظہور ہر حال میں ہوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس کی سنتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، لیکن بہت سے لوگ ان کا خیال نہیں رکھتے اور اس حوالے سے غفلت کا شکار ہوجاتے ہیں، جس کے بعد نتیجہ وہی نکلتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، جسے دیکھ کر ایسے لوگ مایوس ہوجاتے ہیں، چونکہ

کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی سنت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

اگر ایسا نہ ہو تو اس کام کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہی نکلے گا، مگر انسان کی محنت ضائع ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی شخص بنجر زمین میں کاشت کرتا ہے، بیج ڈالتا ہے، ہل چلاتا ہے، مگر پانی نہیں ہے، تو اس بیج سے کوئی فصل پیدا نہیں ہوگی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ پانی ملنے کے بعد کھیت سے فصل اگتی اور پکتی ہے۔

سابقہ امتوں میں بھی اور اس امت میں بھی اللہ تعالیٰ کی سنت ایک ہی رہی ہے، اس میں تبدیلی نہیں آتی، جس کا ذکر قرآن کریم اور احادیث مقدسہ میں بار بار آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (سورة الفتح: 23)

ترجمہ: ''اللہ کی سنت میں تم کبھی بھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔''

(ک) دینی کاموں میں اپنے سے کم تر شخص کو دیکھنا

عبادات اور دیگر دینی کاموں میں ہمیشہ اپنے سے اوپر لوگوں کو مدنظر رکھنا چاہیے، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے سے کم عبادت کرنے والوں یا دینی کاموں سے حوالے سے نیچے لوگوں کو مدنظر رکھے گا تو سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا۔

خصوصاً اس شخص کے لیے تو یہ طرزِ عمل زہر قاتل ہے، جو دینی اعتبار سے کسی مقام پر فائز ہو، اس کا علمی مقام بن گیا ہو، تو فوراً شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ جناب! آپ تو فلاں شخص سے بہت اچھے ہیں، وہ تو ایسے ایسے غلط کام کرتا ہے، وہ تو سرِعام گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے، اس کے گھر فحاشی کے آلات ہیں۔

آپ تو اس سے بہت افضل ہیں، اس لیے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں،

بس آپ تو پہنچی ہوئی سرکار ہیں، یہیں سے اس کے لیے فتنوں کا در کھل جائے گا، وہ اونچے مقام سے قعر مذلت میں گر جائے گا، اس کی نظر ہمیشہ فلاں پر ہوگی کہ وہ تو یہ عبادت نہیں کرتا، میں کرتا ہوں، اس لیے میں اچھا ہوں، وہ دینی لحاظ سے ترقی کرنے کے بجائے تنزل کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک ایسا بھی آئے گا کہ یہ اس فلاں کی طرح ہو جائے گا۔

اس لیے یہ رہنما اصول ہمیشہ اپنے پلے باندھ کر رکھنا چاہیے کہ ہمیں دینی کاموں میں اپنے سے اوپر لوگوں کو دیکھنا چاہیے اور دنیوی امور میں اپنے سے نیچے لوگوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ جس کے دو فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ ہم دینی لحاظ سے ترقی کریں گے اور دوسرا یہ کہ دنیوی لحاظ سے کبھی پریشان نہ ہوں گے۔

مثلاً آپ کے پاس اپنا مکان ہے تو اس شخص کو مدنظر رکھیں، جو کرائے کے مکان میں رہتا ہے، تو آپ کا دل مطمئن ہوگا، اللہ کی نعمت پر شکر کرنا آسان ہوگا۔ لیکن اگر آپ نے اس شخص کو دیکھا کہ جس کے پاس عالی شان بنگلہ ہے، تو آپ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔

اسی طرح آپ اگر کرائے کے مکان میں رہتے ہیں تو اس شخص کو دیکھیں جو فٹ پاتھ پر رہتا ہے، سر چھپانے کو چھت میسر نہیں، یا جھونپڑی میں رہتا ہے تو آپ کا دل اللہ کے شکر سے لبریز ہوگا کہ اللہ نے مجھ پر اتنا کرم کیا ہے کہ میں مکان میں تو رہتا ہوں، چاہے کرائے کا کیوں نہ ہو۔

(ل) اپنے دوستوں اور ہم عمروں کے سامنے گناہ کرنا

اس سے گناہ کرنے والے شخص کے دل میں بہت ہی برا اثر پڑتا ہے، اس کے

دوست احباب اس سے نفرت کریں گے، خصوصاً جب یہ گناہ کبیرہ ہو، اور دوست احباب اس جیسے شخص سے اس کا تصور بھی نہ کرتے ہوں تو وہ اس سے وحشت کھائیں گے، اس کے ساتھ بیٹھنے سے اجتناب برتیں گے، پھر آہستہ آہستہ وہ اس سے بالکل ہی دور ہو جائیں گے، پھر یہ ایسے لوگوں کا ہم نشین بنے گا، جو گناہ کو ذرہ برابر بھی برا نہیں سمجھتے ہوں گے اور نہ اس کو گناہ سے منع کرتے ہوں گے۔

اس لئے ضروری ہے کہ دوست احباب یا عام لوگوں کے سامنے ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کیا جائے اور اگر کسی سے علانیہ طور پر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اللہ سے ڈرے اور اس کی طرف رجوع کرے اور اپنے دوستوں کو بتائے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں نے توبہ کی، اللہ معاف فرمائے اور اپنے دوستوں کو بھی توبہ کی طرف بلائے، پھر کبھی اس قسم کی حرکت نہ کرے، خفیہ گناہ کے مقابلے میں علانیہ گناہ کا وبال بہت سخت ہوا کرتا ہے۔

اس لیے کہ یہ ایک قسم کی خفیہ دعوت ہے، جو گناہ گار دوسروں کو دے رہا ہے کہ وہ اس کی طرح گناہوں میں پڑ جائیں اور دوستوں کو بھی چاہیے کہ اگر ان کے سامنے کوئی غلطی اور گناہ کا ارتکاب کرے تو وہ اسے روکنے اور ٹوکنے کی کوشش کریں، اسے شیطان کے حوالے نہ کریں۔ جیسے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا:

لا يعينوا الشيطان على اخيهم

ترجمہ: ''وہ اپنے بھائی کے خلاف شیطان کا مددگار نہ بنیں۔''

معلوم ہوا کہ سرعام گناہ کرنا اور دیکھنے والوں کا اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا یا

اسے راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کرنا ایک مہلک طرز عمل ہے، جس سے انسان گناہوں کا عادی اور بے حس ہو جاتا ہے، اس لیے یہ بھی بے حسی اور کاہلی و سستی کا ایک سبب ہوا۔

(م) دنیا داروں کی ہم نشینی وصحبت اختیار کرنا

یہ ایک ایسی وبا ہے، جس سے زیادہ تر لوگ غافل ہیں، عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ نیک وصالح اور زاہد شخص کسی اچھے مقصد اور خالص نیت سے دنیا داروں کے پاس جاتا ہے، ان کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے، مثلاً اس کا مقصد انہیں نصیحت کرنا ہے، لیکن ان کی مجلس میں جانے کے بعد ان کی باتیں سنتا ہے۔

جس سے اس کے دل پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے، پھر مسلسل ان کی صحبت اختیار کرتا ہے اور ان کی باتیں سن سن کر ان سے متاثر ہوتا رہتا ہے، کچھ ہی عرصے بعد یہ شخص ایسا نہیں رہتا جیسا کہ پہلے تھا، اب دینی حوالے سے اس کے ارادے پست اور عزائم کمزور ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند، صحبت طالح ترطالح کند

دنیا داروں کے رکھ رکھاؤ اور میل ملاپ کے حوالے سے اسلاف کا طریقہ کار اپنانا چاہیے جو کہ مشہور ومعروف ہے۔ ان حضرات میں سے بعض تو دنیا داروں سے ملنے کو گویا حرام سمجھتے تھے اور اس سے سخت اجتناب برتتے تھے، ان لوگوں کے پاس جانے کے کچھ ضوابط اور اصول ہیں، لیکن ہم اس مختصر رسالے میں انہیں بیان نہیں کر سکتے، لیکن اتنی بات یاد رکھیں کہ ہر وقت اور ہر صورت میں دنیا داروں کے پاس

جانا غیر مناسب نہیں ہے۔

بسا اوقات کسی شرعی مجبوری کی صورت میں ان کے پاس جانا ضروری بھی ہوتا ہے، تاہم جب دینی نقصان کا خطرہ ہو تو ان سے بچنا چاہیے۔

(ن) اولیٰ و عدم اولیٰ کو نہ پہچاننا

کسی بھی معاملے میں اولیٰ اور غیر اولیٰ یا افضل و غیر افضل کو نہ پہچاننے سے انسان پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے، مثلاً کسی کے سامنے بہت سارے امور ہیں، وہ حیران ہے کہ ان میں سے پہلے کسے انجام دیا جائے، اس کی نظر میں ان میں سے ہر ایک ضروری ہے، وہ اس دوران کسی غیر اہم یا غیر اولیٰ کام کو شروع کر دیتا ہے، حالانکہ اس موقع کی مناسبت سے کسی اور کام کو پہلے سر انجام دینا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن وہ اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے اسے موخر کر کے دوسرے کاموں کو مقدم کرتا ہے، جیسے واجب پر مستحب کو مقدم کرتا ہے، یا فرض پر واجب کو مقدم کرتا ہے، یا سنت موکدہ پر مستحب امر کو مقدم کرتا ہے، لازمی بات ہے انسان ضعیف ہے، وہ تمام امور کو کماحقہ بجا نہیں لا سکتا، ایک کو کرنے سے دوسرے کو چھوڑنا یا موخر کرنا پڑے گا، جس سے مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔

اس کا ذہن حیران و پریشان ہوگا، بالآخر اس کے اعصاب پر سستی و کاہلی طاری ہو جائے گی اور وہ کوئی کام بھی اچھے طریقے سے انجام نہیں دے سکے گا، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اہم اور غیر اہم یا افضل و غیر افضل امور کے مابین فرق اور ان کے باہمی مراتب کو سمجھیں اور اسی کے مطابق ان کو بجا لائیں۔

(س) الٹے سیدھے خیالات

سستی وکاہلی اور بے حسی کے پوشیدہ اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے، انسان ایک طویل عرصے تک کسی دینی کام میں لگا رہتا ہے اور بحسن وخوبی اسے انجام دیتا رہتا ہے، اس کی یہ ثابت قدمی انسان کے ازلی دشمن شیطان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اسے اس کام سے دور کر دیا جائے تو وہ اپنے جال بچھاتا ہے اور اس شخص کے دل میں وسوسہ ڈال کر یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ جناب! بس بہت ہو گیا۔

آپ نے اپنے ذمہ جو واجب یا ضروری حصہ تھا اسے ادا کر دیا ہے، بلکہ آپ نے تو اس سے کہیں زیادہ محنت کی ہے، آپ کے علاوہ جن لوگوں کے ذمے یہ کام واجب ہے انہوں نے تو آپ کا آدھا حصہ کام بھی نہیں کیا، آپ کیوں خوامخواہ خود کو اتنا تھکا رہے ہیں، کچھ وقت اپنے اہل وعیال کو بھی دے دیں، اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی سوچیں، اتنی محنت کے بعد تو آپ اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے ہیں، مزید کام کی آپ کو ضرورت ہی نہیں ہے۔

بس پھر شیطان کا یہ نشتر اپنا کام دکھاتا ہے۔ اس شخص کے دل و دماغ پر یہ خیالات حاوی ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ آہستہ آہستہ سستی وکاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، جس دینی کام کو وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے رہا تھا، اسے یکدم چھوڑ دیتا ہے، یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہے۔

شیطان کے وسوسے میں آکر ممکن ہے کہ وہ شخص اپنے سابقہ تمام اعمال کو ضائع کر دے، اگر وہ اپنی نیکیوں پر خود پسندی یا عجب میں مبتلا ہو گیا، یا خدانخواستہ اپنے

اعمال کو اللہ تعالیٰ پر احسان سمجھنے لگا تو وہ برباد ہو جائے گا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۃالحجرات: 17)

ترجمہ: ''ان سے کہو کہ: مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتلاؤ، بلکہ اگر تم واقعی (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔''

مذکورہ آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات اور احادیث مقدسہ میں شیطانی وساوس اور الٹے سیدھے خیالات کی ہولناکی اور ہلاکت خیزی کا تفصیلی ذکر آیا ہے۔ کچھ تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

(ع): سستی و کاہلی کے علاج میں سستی:

جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے کہ سستی ایک مستقل مرض ہے، ظاہر ہے کہ ہر بیماری کی شدت ابتدا میں کچھ کم ہوتی ہے، جب انسان اس کے علاج و معالجے میں سستی سے کام لیتا ہے اور بروقت علاج کی فکر نہیں کرتا تو مرض بڑھ جاتا ہے، یہی حال سستی و کاہلی کی بیماری کا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس باطنی مرض کے علاج کی فکر کرے۔

اس کے اسباب کو تلاش کرے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، لیکن خدانخواستہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ سستی کے علاج میں بھی سستی سے کام لے تو پھر اس مرض کا علاج مشکل ہو جائے گا، پھر اسے ختم کرنے کے لیے کئی گنا زیادہ محنت کرنی پڑے گی اور اس کے لیے وقت بھی بہت زیادہ درکار ہوگا۔

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے، اس لیے ہر انسان کو فطری طور پر سستی و کاہلی لاحق

ہوتی ہے، لیکن اس کا مقابلہ کرنے میں انسانوں کی مختلف قسمیں ہیں، بعض تو فوراً ہی اسے دور بھگانے کی فکر کرتے ہیں اور سستی کی وجہ سے جو کمی کوتاہی ہوئی ہے، اس کی تلافی کا انتظام کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

وہ سستی کا مقابلہ بھی سستی سے کرتے ہیں، کمی کوتاہی کی تلافی میں بھی سستی برتتے ہیں اور سستی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور وہ سست و کاہل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد بھی سستی کی اس دوسری قسم کو ختم کرنا ہے۔

بہر حال مسلمان کو چاہیے کہ وہ کسی بھی مشکل وقت میں ہتھیار نہ ڈالے، چاہے اس نے ابتدا میں غفلت کا مظاہرہ کیا ہو تب بھی مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں، بعض اشیاء کا شر بعض کے مقابلے میں کم ہوتا ہے، یعنی علاج ہر حال میں ممکن ہے۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نازل نہیں فرمائی جس کا علاج نہ اتارا ہو۔

باب نمبر: 9

سستی و کاہلی کے علاج کا بیان

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ سستی و کاہلی باطنی امراض میں سے ایک خطرناک مرض ہے، لیکن اس کا نقصان اور ضرر اس وقت کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب انسان کو اس کا احساس نہ ہو، پھر یہ مرض بھی انسان کو معنوی و باطنی طور پر ایسے ہی موت کے گھاٹ اتار دے گا، جیسے کہ وہ جسمانی مرض انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، جس کا اسے احساس نہ ہو یا احساس تو ہو لیکن اس کے مہلک ہونے کا علم نہ ہو تو انسان اس کے علاج کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا اور مرض اندر سے انسے کھاتا رہتا ہے۔

حتیٰ کہ اسے بالکل ہی کھوکھلا کر دیتا ہے، جب اسے احساس ہوتا ہے، تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، اب اس کے نقصان کا تدارک ممکن نہیں ہوتا اور یوں اس مرض کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہی حال سستی جیسی باطنی ومعنوی بیماریوں کا بھی ہے۔

سستی و کاہلی ایک ایسی خطرناک معنوی و باطنی بیماری ہے، جو انسان کو روحانی طور پر ہلاک کر دیتی ہے، یعنی یا تو اس کی وجہ سے انسان دین حق اور راہ راست سے ہٹ کر گمراہ ہو جاتا ہے یا اعمال صالحہ کو چھوڑ کر آخرت کی بہت سی دائمی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

دین حق سے انحراف برت کر گمراہ ہونے والوں کے اعصاب پر گمراہی سے پہلے سستی و کاہلی چھا جاتی ہے تو گمراہی کے جہاں اور بھی دیگر اسباب ہیں وہیں ایک بڑا سبب یہی سستی و کاہلی ہے۔

اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہو جاتی ہے کہ سستی و کاہلی کا علاج جلد از جلد کرنا کتنا ضروری ہے، کسی بھی بیماری کا علاج شروع کرنے سے پہلے اس کے لاحق ہونے کے اسباب کو تلاش کر کے انہیں ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لیے سستی کے علاج میں پہلے ان اسباب کا راستہ روکنا پڑے گا، جن کی وجہ سے انسان سستی کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر سستی کو ختم کرنے والے عوامل کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کہ کنویں میں کتا گر جائے تو پہلے کتے کو باہر نکالا جاتا ہے، پھر کنویں کی صفائی و پاکی کا اہتمام کیا جاتا ہے، اگر کتا کنویں میں پڑا رہے تو ہزار کوششوں کے باوجود کنواں پاک نہیں ہو سکتا۔ یا کسی کو سردی کی وجہ سے نزلہ زکام اور بخار ہو جائے تو سب سے پہلے سردی سے بچاؤ کا اہتمام ہوتا ہے، اس کے بعد پھر بخار کی دوا لی جاتی ہے۔ اگر دوا لینے کے باوجود سردی سے بچاؤ کا اہتمام نہ ہو تو دوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تو کسی بھی بیماری کا علاج کرتے وقت پہلے اس بیماری کے اسباب کی بیخ کنی کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح سستی کے علاج میں بھی ہم پہلے ان اسباب کو ختم کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں، جن سے سستی لاحق ہوتی ہے، اس کے بعد انشاء اللہ اس مرض سے نجات آسان ہو جائے گی۔

سستی و کاہلی کے اسباب کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ وہیں ہر سبب کے ساتھ ہم نے مختصراً اس کا علاج بھی بیان کیا ہے، اس لیے ان باتوں کو ہم یہاں دوبارہ ذکر نہیں کریں گے، تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے، تاہم موقع کی مناسبت سے ان کی طرف اشارہ ضرور کریں گے، اگر ضروری سمجھا تو ان کا اعادہ بھی کریں گے، قارئین کو

اس سے بور ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس تکرار کو آپ بے فائدہ نہ سمجھیں۔ بسا اوقات تکرار ضروری بھی ہوتا ہے۔

بہرحال ہم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے سستی اور اس کے اسباب سے نجات کے طریقوں کا بیان شروع کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں حق و سچ بات کہنے کی توفیق دے۔

(1) ایمان کی تجدید

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الایمان یخلق فی جوف احدکم کما یخلق الثوب فاسألوا الله ان یجدد الایمان فی قلوبکم

ترجمہ: ''بلاشبہ تم میں سے ایک شخص کے اندر کا ایمان ایسے ہی پرانا اور بوسیدہ ہوجاتا ہے جس طرح کہ کپڑا بوسیدہ ہوجاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے دلوں میں ایمان کی تجدید کرے۔'' (المستدرك للحاكم و الطبرانی)

ایک دوسری حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

''دلوں میں سے کوئی دل ایسا نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کے لیے چاند کی طرح بادل نہ ہوں (جس طرح بادل چاند کو ڈھانپ لیتے ہیں، اسی طرح دل کے اوپر ایسے ہی بادل چھاتے اور اسے ڈھانپ لیتے ہیں) چاند تو روشن ہوتا ہے، لیکن جب اس پر بادل آجاتے ہیں تو وہ بے نور نظر آتا ہے اور جب بادل چھٹ جاتے ہیں تو پھر چمکنے لگتا ہے۔'' (اخرجه ابو نعیم فی الحلیة)

معلوم ہوا کہ ایمان کی تجدید ضروری ہے، اگر تجدید نہ ہو تو بہت سی باطنی بیماریاں اسے گہنا دیں گی، بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ایمان کی تجدید نسخہ کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے، ان بیماریوں میں سے ایک سستی و کاہلی بھی ہے، یہی تو وجہ ہے کہ سلف صالحین اور علماء ربانیین ہمیشہ اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اس کی طرف اشارہ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (سورۃ الاعراف:201)

ترجمہ: ”جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، انہیں جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آ کر چھوتا بھی ہے تو وہ (اللہ کو) یاد کر لیتے ہیں، چنانچہ اچانک ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔“

قرآن کریم میں جہاں ایمان میں اضافے اور زیادتی کا ذکر آیا ہے، ان آیات کو اس پر محمول کر سکتے ہیں، کہ اس سے مراد ایمان کی حفاظت اور اس کی تجدید ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (سورۃ الفتح: 4)

ترجمہ: ”تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (سورۃ التوبہ: 124)

ترجمہ: جو (واقعی) ایمان لائے ہیں، ان کے ایمان میں تو اس سورت نے واقعی اضافہ کیا۔“

ایمان میں اضافہ اور اس کی تجدید کا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ ایمان کی تجدید اور اس میں اضافہ یا زیادتی کیسے ہوگی؟ تو اس کے کئی طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ کثرت عبادت سے ایمان میں اضافہ اور اس کی تجدید ہوگی، اسی طرح سنن اور نوافل کا اہتمام بھی اس حوالے سے مدومعاون ہے۔

تہجد کی نماز کی پابندی تو گویا ایک نسخہ کیمیا ہے، سفر اور حضر میں صلوٰۃ وتر کی پابندی، نفلی روزے رکھنا، خاص کر کے ان ایام میں جن کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اسی طرح گرمیوں میں نفلی روزے رکھنے سے ایمان میں اضافہ اور اس کی تجدید ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ ایمان میں اضافہ کرنے والے امور میں سے چھپا کر صدقہ دینا بھی ہے، صلہ رحمی سے بھی ایمان مضبوط اور زیادہ ہوتا ہے، یتیموں، مسکینوں اور فقراء کے ساتھ ہمدردی بھی ایمان میں اضافے کا باعث ہے، اسی طرح حج وعمرہ، اعتکاف اور نماز کے مقررہ اوقات سے پہلے مسجد کی طرف رجوع کرنے سے بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ ایسے امور ہیں، جن سے مومن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، اسے ایسی ایمانی قوت حاصل ہوتی ہے، جس کے سبب وہ کسی بھی رکاوٹ کو آسانی سے راستے سے ہٹا سکتا ہے، یہی تو وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ کو جب بھی کوئی پریشان کن امر کا سامنا ہوتا تو آپ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے اور آپ فرمایا کرتے:

ارحنا یا بلال بالصلاۃ (ابو داؤد: کتاب الادب)

یعنی: ''اے بلال! نماز کو قائم کر کے ہمیں راحت پہنچاؤ۔''

(2) مراقبہ اور ذکر اللہ کی کثرت

مراقبہ کسے کہتے ہیں؟ تو اس کی حقیقت اور اس کی تشریح حدیث پاک میں بیان کی گئی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك

(اخرجه مسلم، كتاب الايمان)

ترجمہ: ''تم اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو جیسا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت طاری نہ ہو سکے تو کم از کم یہ کیفیت تو پیدا کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

پھر مراقبے میں چند امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان کے بغیر مراقبہ نہیں ہو سکتا۔

(1): اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی خشیت دل پر طاری ہو۔

(2): اللہ عزوجل کی عظمت دل و دماغ میں جاگزیں ہو۔

(3): اس بات کا کامل ایمان ہو کہ وہ مجھے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، میرے ہر فعل و عمل کا وہ اپنے علم کامل سے احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

(4): دل میں اس کی محبت ہو اور اس سے ثواب و عطا کی امید ہو۔

جس شخص کے دل میں مذکورہ بالا چاروں چیزیں موجود ہوں تو ممکن نہیں کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کے مراقبہ سے غافل ہو جائے، اسے اللہ تعالیٰ کا دھیان نہ رہے، اس کی عبادت میں سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے۔

مذکورہ کیفیت کے حصول کا طریقہ

یہ کیفیت کیسے حاصل ہو گی؟ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کیفیت کے حصول میں بہت

معاون ثابت ہوتا ہے، کہ مومن ہر وقت اللہ کی یاد، اس کی تسبیح و تہلیل اور اس کی تحمید و تمجید میں رطب اللسان ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے یہ کیفیت حاصل نہ ہو۔ یہی تو وجہ ہے کہ قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ کی بے شمار احادیث میں ذکر الٰہی پر روز دیا گیا ہے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (سورة الاحزاب: 41)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (سورة العنكبوت:45)

ترجمہ: ''اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورة الرعد: 28)

ترجمہ: ''یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے، جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

جناب رسول کریم ﷺ نے اذان کو ''دعوت تام'' یعنی مکمل دعوت قرار دیا ہے۔ (بخاری شریف)

اسی طرح آپ ﷺ کی اپنی زبان مبارک ہمیشہ اللہ کی یاد سے تروتازہ رہتی تھی، اس لئے کہ حدیث پاک میں حکم دیا گیا ہے:

لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله (اخرجه الترمذی، کتاب الدعوات)

ترجمہ: ''تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہنی چاہیے۔''

قرآن کریم کی تلاوت افضل ترین ذکر ہے، اس لیے مسلمان کو چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ وقت قرآن کریم کی تلاوت کے لیے مختص کرے اور اسے اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں درج نہ ہو، جنہوں نے قرآن کریم کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور قیامت کے دن رسول کریم ﷺ ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کے دربار عالی میں مقدمہ دائر کرتے ہوئے فرمائیں گے:

يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (سورة الفرقان: 30)

ترجمہ: اور رسول (ﷺ) کہیں گے کہ: یارب! میری قوم اس قرآن کو بالکل چھوڑ بیٹھی تھی۔"

قرآن کریم کو چھوڑنے اور پس پشت ڈالنے کا اطلاق عملاً چھوڑنے پر ہوتا ہے اور تلاوت چھوڑنے پر بھی۔ اس لیے قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ وہ دل پر اثر کرے اور مومن کے لیے اعمال صالحہ اختیار کرنا آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورة محمد: 24)

ترجمہ: "بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا دلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں جو دلوں پر پڑا کرتے ہیں؟"

ہمارے زمانے کے بہت سے دینی طلبہ اور دعوتی کام کرنے والے حضرات قرآن کریم کے حق کی ادائیگی اور ذکر الٰہی کے حوالے سے کافی غفلت کا شکار ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نماز کے بعد اذکار مسنونہ کا اہتمام نہیں کرتے، صبح وشام

کی مخصوص دعائیں اور اذکار کو بالکل چھوڑ رکھا ہے، ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم تو دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اسی مصروفیت کی وجہ سے ہمارے پاس وقت نہیں ہے کہ ان اذکار کی پابندی کریں، یاد رکھیں یہ شیطان مردود کا دھوکہ ہے، ہمارے سلف صالحین ذکر الٰہی کا شدت سے اہتمام کرتے ہیں، وہ تو اس آیت قرآنی کے مصداق تھے۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (سورۃ آل عمران: 191)

ترجمہ: ''جو اٹھتے بیٹھے اور لیٹتے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔''

اس آیت قرآنی میں ذرا غور فرمائیں:

فاذکرونی اذکرکم

ترجمہ: ''تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔''

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ رب العزت اسے یاد کرے تو کیا وہ غفلت کا شکار ہوسکتا ہے؟

مشکل امور کی انجام دہی روحانی قوت کے بغیر ناممکن ہے

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ذکر الٰہی سے انسان کو ایسی روحانی قوت حاصل ہوتی ہے، جس کے ہوتے ہوئے وہ ایسے ایسے امور سر انجام دیتا ہے، جن کی انجام دہی اس روحانی قوت کے بغیر ناممکن ہیں۔

میں نے اپنے استاذ جلیل حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو اپنی آنکھوں

سے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چلنے پھرنے، بولنے اور لکھنے میں ایسی قوت عطا فرمائی تھی، جس سے انسانی عقل دنگ رہ جائے، حضرت ایک ہی دن میں اتنے صفحات تحریر فرماتے تھے کہ انہیں لکھتے لکھتے کاتب پورا ہفتہ لگاتا تھا، میدان کارزار میں بھی میں نے حضرت کی حیرت انگیز قوت کا مشاہدہ کیا ہے۔'' (الوابل الصیب: ص:155)

ذکر الٰہی سے دل اور روح کو قوت ملتی ہے

ذکر کے فوائد بیان کرتے ہوئے ایک اور مقام پر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ذکر الٰہی سے دل اور روح کو قوت ملتی ہے، جب مومن اسے چھوڑ دیتا ہے تو اس کی مثال ایسے ہی ہوتی ہے جیسے کہ کسی جسم سے اس کی قوت کو سلب کرلیا جائے۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فجر کی نماز کے بعد اللہ کے ذکر کرنے بیٹھ گئے، تقریباً آدھا دن گزر گیا، مگر حضرت یاد الٰہی میں مشغول رہے، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ میرا ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری قوت جاتی رہے گی۔'' (الوابل الصیب: ص، 85)

اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق کے بغیر ذکر الٰہی کرنا ناممکن ہے

امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول کریم صلی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا:

''اے عبداللہ بن قیس! (یہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا اپنا نام ہے، ابوموسیٰ ان کی کنیت ہے، جس سے وہ مشہور ہوئے) میں نے کہا لبیک یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں وہ کلمہ نہ بتاؤں جو جنت کے خزانوں میں سے

ایک خزانہ ہے؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، (ضرور بتایئے گا) فرمایا: ''لا حول و لا قوۃ الا باللہ'' یعنی اللہ کی مدد و توفیق کے بغیر کسی گناہ سے بچنا ممکن نہیں اور اس کی توفیق کے بغیر کوئی نیکی کرنا بھی ممکن نہیں۔''

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، صحیح مسلم کتاب الذکر)

ایک اور روایت میں ہے کہ ''اے عبداللہ بن قیس! لا حول و لا قوۃ الا باللہ پڑھا کرو، اس لیے کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔''

(صحیح مسلم، کتاب الذکر)

لا حول...... ایک چھوٹا سا کلمہ ہے، لیکن شیطانی وساوس، نیکیوں کی راہ میں رکاوٹوں اور گناہوں کے اسباب کو دور کرنے میں یہ عجب تاثیر رکھتا ہے۔ اسی طرح ظالم بادشاہ کے ظلم اور پریشانیوں سے چھٹکارہ دلانے میں بھی یہ کلمہ بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(3) اخلاص اور تقویٰ

جس طرح اخلاص کی کمزوری سستی وکاہلی کا بہت بڑا سبب ہے، اسی طرح اخلاص اور اسے پیدا کرنے سے محنت بھی سستی وکاہلی کو دور کرنے کا ایک اہم اور موثر ذریعہ ہے، اس لیے کہ مخلص اور متقی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ ایسا نور پیدا فرمادیتا ہے، جس سے وہ سستی جیسی بے شمار باطنی بیماریوں سے نجات پاتا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَاناً (سورۃ الانفال: 29)

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کے ساتھ تقویٰ کی روش اختیار کرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کی) تمیز عطا کردے گا۔''

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا

ترجمہ: ''ذرا بتاؤ کہ جو شخص مردہ ہو، پھر ہم نے اسے زندگی دی ہو، اور اس کو ایک روشنی مہیا کردی ہو، جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہو، کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ اندھیروں میں گھرا ہوا ہو جس سے کبھی نکل نہ پائے؟'' (سورۃ الانعام: 122)

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ، وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورۃ الحدید: 28)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ، تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے اور تمہارے لیے نور پیدا کرے جس کے ذریعے تم چل سکو اور تمہاری بخشش فرمادے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔''

طلب علم اور دعوت دین کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں، جیسے خواہشات نفسانی، عجب وخود پسندی، دنیا سے تعلق، اس قسم کی مہلک چیزوں کا علاج تقویٰ و اخلاص ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

ترجمہ: ''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (سورۃ العنکبوت:69)

ہم نے اپنے زمانے کے بہت سے ایسے علماء کو دیکھا ہے، جو اسی نوے کے پیٹے میں ہیں، لیکن وہ ایسے چاک و چوبند اور چست ہیں کہ لگتا ہے تیس سالہ نوجوان ہیں، اس کا راز سوائے تقویٰ و اخلاص کے کچھ نہیں ہے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے، وہ مرحمت فرماتا ہے، ہم ان کے بارے میں یہی اچھا گمان رکھتے ہیں، باقی حقیقت حال کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔

(4) دل و دماغ کو پاک صاف کرنا

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شرح صدر کا ذکر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان جتلایا ہے، فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (سورۃ الانشراح: 1)

ترجمہ: ''(اے پیغمبر!) کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟''

اور اہل جنت کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (سورۃ الاعراف: 43)

ترجمہ: ''اور ان (جنتیوں) کے سینوں میں (ایک دوسرے سے دنیا میں) جو کوئی رنجش رہی ہوگی، اسے ہم نکال باہر کریں گے۔''

ان مومنین کی بھی تعریف فرمائی ہے جو اپنی دعاؤں میں یہ کہتے ہیں کہ

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورۃ الحشر: 10)

ترجمہ: ''اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی بغض نہ رکھئے۔''

ایک ہی آیت میں مومنین اور کافرین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ

(سورۃ الانعام: 125)

ترجمہ: ''غرض جس شخص کو اللہ ہدایت تک پہنچانے کا ارادہ کر لے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جس کو (اس کی ضد کی وجہ سے) گمراہ کرنے کا ارادہ کر لے، اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے، کہ (اسے ایمان لانا

ایسا مشکل معلوم ہوتا ہے) جیسے اسے زبردستی آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔''

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ بغض وکینہ، حسد وعداوت اور بدگمانی جیسے برے اوصاف سے دل کو پاک کرنا بہت ضروری ہے، شرح صدر اور دل کی پاکی تقریباً ایک ہی چیز ہیں، شرح صدر کے بغیر دل کی پاکی نہیں ہوسکتی،

جس شخص کا دل ان برے اور گندے اوصاف سے آلودہ ہوتو وہ نیکی کی طرف سبقت نہیں لے جاسکتا، بلکہ وہ دینی امور میں سستی وکاہلی کا شکار ہوجائے گا، اس کی دنیوی زندگی بھی خوشگوار نہیں ہوسکتی، لیکن اس کے برعکس جو شخص قلب سلیم کا مالک ہو، اس کا دل اس قسم کی آلودگیوں سے پاک ہوتو وہ ہر نیک عمل میں چستی ونشاط کا مظاہرہ کرے گا۔

یہی ہمارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خاصیت تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے:

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (سورة الصافات: 84)

ترجمہ: ''جب وہ اپنے پروردگار کے پاس صاف ستھرا دل لے کر آئے۔''

مندرجہ ذیل امور کی پابندی سے دل پاک وصاف ہوجاتا ہے:

صلحاء اور دین داروں کی ہم نشینی

(الف): دعوت دین کے کام سے وابستہ لوگوں کی قربت اور ان کی ہم نشینی اختیار کی جائے، ان سے محبت کی جائے اور ان کی بات سنی جائے۔

معاف کرنے اور حسن سلوک کی عادت اپنانی چاہیے

(ب): کسی سے غلطی ہوجائے اور وہ معذرت کرے تو اس کے عذر کو قبول کرنے

کی عادت ڈالی جائے، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہوئے ان کی ہر قول وفعل کی بہتر سے بہتر توجیہہ کی جائے، اگر کسی کی طرف سے برائی کا سامنا ہو تو اس کا جواب برائی سے نہ دی جائے، بلکہ اس سے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے، جس کا نتیجہ بہت بہتر صورت میں سامنے آئے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

ترجمہ: ''تم بدی کا دفاع ایسے طریقے سے کرو جو بہتر ہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہو جائے گا، جیسے وہ (تمہارا) جگری دوست ہو۔'' (سورۃ فصلت:34)

معافی اور درگزر سے کام لینا یہ مرد کی زینت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (سورۃ الشوریٰ: 40)

ترجمہ: ''پھر بھی جو معاف کردے اور اصلاح سے کام لے تو اس کا ثواب اللہ نے ذمے لیا ہے۔''

اپنے خلاف پروپیگنڈوں پر دھیان نہ دیا جائے

(ج): ہر ایک کی بات پر دھیاں نہ دیا جائے، کسی مسلمان بھائی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس نے آپ کے خلاف کوئی بات کی ہے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو خوب تحقیق کریں، تحقیق سے پہلے نہ اپنے دل میں اس کے بارے میں کوئی برائی لائیں اور نہ ہی اس کے خلاف کچھ کرنے کی منصوبہ بندی کریں، ہوسکتا

ہے کہ کسی نے غلط اطلاع دی ہو، یا یہ چغل خوروں کی کارستانی ہو۔

اگر کسی مسلمان کے ساتھ جھگڑا ہو جائے یا کسی وجہ سے بات خراب ہو جائے تو پھر صلح صفائی میں سبقت کریں، جتنی غفلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیر کریں گے، شیطان کو اتنے ہی آگ لگانے کے مزید مواقع ملیں گے۔

کسی بھی صحابی کے لئے خصوصیت کے ساتھ جنت کی بشارت کو مدنظر رکھیں

(د): ہمیشہ رسول کریم ﷺ کے اس صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ مدنظر رکھیں، جسے جنت کی بشارت دی گئی تھی، ان صحابی کی خوبی یہ تھی کہ ان کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے سونے سے پہلے سب کو معاف نہ کر دیا ہو اور ان کے دل میں کسی کے بارے میں کھوٹ ہو۔

سورۂ حشر کی آیت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں دل کو صاف رکھنا تو مومن مخلص کی صفت ہے، ہمیں بھی چاہیے کہ ہمارا شمار مخلص مومنین میں ہو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

(5) علم دین کی طلب

دین کا علم ایک ایسا نور ہے، جس کے سبب اللہ تعالیٰ انسان کے درجات کو بہت بلند کرتا ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

ترجمہ: ''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا۔'' (سورة المجادلة:11)

علماء کرام ہی اللہ تعالیٰ سے حقیقی معنوں میں ڈرتے ہیں، اس لیے کہ انہیں اللہ کی معرفت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورة فاطر: 28)

ترجمہ: ''اللہ کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''

عالم و جاہل میں آسمان زمین کا فرق ہے، رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورة الزمر:9)

ترجمہ: ''کہو کہ: ''کیا وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ (مگر) نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

اس لئے مسلمان کو چاہیے کہ وہ علم دین کے حصول کی کوششوں میں لگا رہے، جتنا علم بڑھتا جائے اس کے ساتھ ساتھ عمل میں بھی اضافہ ہوگا، اس لیے کہ علم دین سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یہی تو وجہ ہے کہ عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے کہ چاند کو سارے ستاروں پر فضیلت پر حاصل ہے۔

عمل کے بغیر علم وبال ہے

علمی مجالس میں شرکت اور علمی کتابوں کے مطالعے سے انسانی کی علمی استعداد میں اضافہ ہوگا، جب مطالعہ کا شوق بڑھے گا تو انسان کی علمی پیاس نہیں بجھے گی، وہ مزید رات دن علم کی جستجو میں لگا رہے گا، اس کی نظر ہمیشہ آگے بڑھنے پر ہوگی، یوں وہ کمزوری اور سستی و کاہلی سے نجات پائے گا، اس کی زندگی چستی ونشاط سے عبارت ہوگی۔

علم دین کے باب میں کچھ اہم باتیں مدِنظر رکھنا ضروری ہے، ان میں سے سرفہرست یہ بات ہے کہ علم کی فضیلت عمل کی وجہ سے ہے، علم عمل کا باعث بنتا ہے، انسان کو عمل پر ابھارتا ہے، اس سے سستی و کاہلی کو دور کرتا ہے، وہ علم کی روشنی میں عمل کے فضائل کو پہچانتا ہے اور عمل شروع کرتا ہے، ورنہ اگر علم کے بعد عمل نہ ہو تو ایسا علم قابل تعریف تو کیا وبال جان ہے۔

ایسے دو اشخاص برابر نہیں ہو سکتے، جن میں سے ایک عبادت تو کرتا ہے لیکن اس کی فضیلت سے لاعلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کے کرنے والوں کے لیے کیا کیا نعمتیں تیار کر رکھی ہیں اور دوسرا شخص عبادت کرتا ہے، لیکن اس کو شریعت اور فقہ کا علم ہے، وہ مسائل کو بھی جانتا ہے اور فضائل سے باخبر ہے، اسے بخوبی علم ہے کہ کس عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ کس اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہی تو وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے منافقین پر فجر اور عشاء کی نماز کے بوجھل ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

و لو یعلمون ما فیھما لأتوھما و لو حبوا (اخرجہ البخاری: کتاب الاذان)

ترجمہ: ''اگر ان منافقین کو معلوم ہوتا کہ ان دونوں نمازوں میں کتنا اجر وثواب ہے تو وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر بھی ان کی ادائی کے لیے آتے۔''

اس حدیث میں رسول کریم ﷺ نے نمازوں میں سستی و کاہلی کا سبب عدم معرفت یعنی اجر وثواب سے ناواقف ہونے کو قرار دیا ہے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ سستی کی کئی قسمیں ہیں، جن میں سے سب سے خطرناک قسم منافقین کی سستی ہے۔

لازمی بات ہے جب اجر وثواب کی عدم معرفت کے سبب منافقین نیک اعمال میں سستی و کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کے سبب مسلمان تو بدرجہ اولیٰ اس مرض کا شکار ہوں گے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو صبر کی فضیلت کا علم ہو تو اس کیلئے گناہ سے بچنے میں صبر کرنا اور نیکی پر ثابت قدم رہتے ہوئے صبر کرنا بہت آسان ہو جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کرے گا:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورۃ الزمر: 10)

ترجمہ: ''جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں، ان کا ثواب انہیں بے حساب دیا جائے گا۔''

یہ آیت اس کے لیے سستی سے بچنے میں مضبوط قلعے کا کام دے گی، لیکن اس کے برعکس جس شخص کو صبر کی فضیلت کا علم نہ ہو تو اس کے لیے صبر کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اسی طرح اعمال صالحہ کی فضیلت اور اعمال بد کی نحوست اور اس پر عتاب کا بیان بھی انسان کو راہ راست پر چلنے کا کافی مدد دیتا ہے، اس مذاکرے سے وہ کوتاہی اور غفلت یا سستی و کاہلی سے بہت حد سے بچ سکتا ہے، یہ اس مرض کا کافی شافی علاج

ہے، وعظ ونصیحت سن کر بہت سے لوگوں کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَاناً وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ

ترجمہ: ''مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔'' (سورۃ الانفال: 2)

کتنے لوگ ایسے ہیں جن کی زندگیاں وعظ ونصیحت سننے سے بدل گئیں، ان کے ایمان کی تجدید ہوگئی اور وہ سستی کی چادر پھینک کر چست ہو گئے اور اعمال صالحہ میں جت گئے، اللہ تعالیٰ کا فرمان سچ ہے:

وَّذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤمِنِیْنَ (سورۃ الذاریات: 55)

ترجمہ: ''اور نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو فائدہ دیتی ہے۔''

(6) اپنی حقیقت وحیثیت کو سمجھنا

یہ علم دین ہی کا ایک حصہ ہے، لیکن اس کی اہمیت وافادیت کے سبب اسے میں نے الگ عنوان کے تحت ذکر کیا ہے، اس لئے کہ سستی وکاہلی کے علاج میں اس کی تاثیر مسلم ہے۔

مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو پہچان لے، اپنی حقیقت وحیثیت کو سمجھ لے، وہ سوچ لے کہ میں کون ہوں، کس امت سے میرا تعلق ہے، مجھے کس لیے پیدا کیا گیا ہے اور میں کیا کررہا ہوں، کیا میری صبح وشام کی محبت اس مقصد کے موافق ہے جس کے لیے میری تخلیق کی گئی ہے، یا میں کسی اور ڈگر پر چل رہا ہوں اور وقت ضائع کررہا ہوں، اس طرح اس کے لیے سستی وکاہلی سے نجات پانا آسان ہوجائے گا۔

اگر اس کے دل میں ادنیٰ بھی ایمان ہوگا تو اسے یہ کیسے گوارا ہوگا کہ جس امت کا وہ ایک فرد ہے، اس پر کیا بیت رہا ہے، کیسے دشمنوں نے اسے نوچنے کے لیے اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کر کے ایک دوسرے کو ایسے بلایا ہے، جس طرح بھوکے دسترخوان میں ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔

اس امت کی زمینوں پر یہود ونصاریٰ نے قبضہ کر رکھا ہے اور امت کے بے سہارا لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں، دنیا بھر اس امت کی عفت مآب بہنوں اور ماؤں کی عزتوں سے کھیلا جارہا ہے۔ اس کے بچے یتیم کئے جارہے ہیں۔

افغانستان سے بوسینیا تک، صومال سے فلسطین تک اور فلپائن سے برما تک ہر جگہ خون مسلم کی ارزانی ہے، پانی کی طرح بہایا جارہا ہے اور میں امت کے لیے کچھ

کرنے کے لیے ہر وقت سوتا رہتا ہوں، میں اپنے لیے ہی کچھ نہیں کر رہا تو امت کے کس کام آتا۔اس طرح خود بخود وہ سستی و کاہلی سے نکلے گا۔

ایک مریض اسٹریچر پر تڑپ رہا ہے، اس کا سارا بدن خون آلود ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ سینے میں دل رکھنے والا کوئی ڈاکٹر ہاتھ پہ ہاتھ ڈال کر بیٹھ جائے اور اس کی کوئی مدد نہ کرے اور مریض ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے منہ میں چلا جائے؟؟

کسی ملک کی سرحد پر دشمن نے ڈیرہ جمالیا ہو اور وہ ہر طرح کے اسلحے سے لیس ہو تو کیا کسی محبِّ وطن فوج سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایمرجنسی کا اعلان کر کے سرحدات کی حفاظت کے بجائے بیرکوں میں سوتی رہے؟؟

کسی علاقے کے لوگ شرک و بدعات اور جاہلانہ رسومات میں مبتلا ہوں، دین کے باغی اور اللہ کا دشمن بن کر سرعام گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہوں اور انہی میں سے کسی مخلص عالم دین کو یہ گوارا ہوگا کہ وہ اپنی عبادات اور علمی مشاغل میں مگن رہے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوئی فکر نہ کرے، چاہے وہ جہنم کا دائمی ایندھن بن جائیں؟؟

ظاہر ہے کہ یہ سب ناممکن ہے، اسی طرح جو شخص اپنی حقیقت کو پہچانے کہ میں کس عظیم امت کا فرد ہوں اور اس امت کا کیا حال ہے، اس صورتحال میں میری کیا ذمہ داریاں ہیں، اس کے بعد بھی کیسے ممکن ہے کہ وہ سستی کا شکار ہو جائے، یہ بہت بعید ہے۔

مگر جو شخص امت مسلمہ میں شامل ہونے کا زبانی دعویدار ہو اور اسے ذلت و رسوائی کی کوئی پروانہ ہو، عزت نفس نامی کوئی چیز اس کی لغت میں نہ ہو، تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے بھیانک حالات میں بھی سستی و کاہلی کو گلے سے لگائے رکھے اور بے حسی

کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑا رہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ (سورة الحج:18)

ترجمہ: ''اور جسے اللہ ذلیل کردے کوئی نہیں ہے جو اسے عزت دے سکے۔''

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

من يهن يسهل الهوان عليه

ما بجرح بميت ايلام

ترجمہ: ''جو خود کو ذلیل ورسوا کرتا ہے تو اس کے لیے ذلت بھی آسان ہو جاتی ہے (یعنی پھر اسے مزید ذلتوں اور رسوائیوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی) جس طرح کہ مردے کے جسم پر کئی زخم ہوتے ہیں، لیکن اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی (رسوائیاں و ذلتیں برداشت کر کر کے اس کا ضمیر بھی مردہ ہو گیا ہے)

اگر آپ کو اپنی حقیقت نہیں معلوم تو خواب خرگوش کے مزے لیتے رہو، آپ کو یہ بے حسی مبارک ہو۔

(7) درست منہج اور صحیح راستے کا انتخاب

دین کے داعی اور طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا تعین کرے کہ جس راستے اور منہج کو اس نے اختیار کیا ہے، آیا وہ درست بھی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ ہمارے زمانے میں مدارس دینیہ اور دین کی خدمت کے دعویداروں کی کمی نہیں ہے، ہر جماعت اور تنظیم کے پیروکار اپنے آپ کو برحق سمجھتے ہیں۔

ہر مکتب فکر کے علماء اور مدارس والے اپنے آپ کو اہل حق باور کر کے اپنی طرف بلاتے ہیں، اس دور میں یہ طے کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کون برحق اور کون ناحق ہے، اس لیے کہ قابل اور جاہل ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، ہر ایک وصلِ لیلیٰ کا دعویدار ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی خدمات کو دینی کاموں کے لیے وقف کرتا ہے، جیسے دعوت الی اللہ کا مبارک کام کرنا چاہتا ہے یا علم دین کے راستے پر چلنا چاہتا ہے، اگر خدانخواستہ وہ کسی غلط راستے پر چل پڑا اور فاسد نظریات والوں کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کی محنت ضائع ہو جائے گی، بلکہ وہ تذبذب اور شکوک وشبہات کا شکار ہو کر وہ راستہ ہی چھوڑ دے گا۔

جب کسی کو اس راستے کے بارے میں سو فیصد برحق ہونے کا یقین نہ ہو جسے اس نے اپنایا ہے تو اس کا اس پر ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، پھر کچھ عرصے تک اگر وہ اس کے ساتھ وابستہ بھی رہے تو آگے چل کر اس طریقے کا شرعاً غلط ہونا اس کے سامنے واضح ہو جائے گا۔

اس کی سابقہ ساری محنتیں اسے رائیگاں نظر آئیں گی، جس پر وہ ساری زندگی کف افسوس ملتا رہ جائے گا، پھر عین ممکن ہے کہ وہ اس کے بعد قنوطیت (مایوسی) کا

شکار ہو جائے، اس دوران شیطان اپنا کام دکھائے گا اور اسے دوبارہ یہ پٹی پڑھائے گا کہ جناب! جس راستے پر آپ ہیں، یہی برحق ہے، یوں ساری زندگی وہ غلط طریقے پر چلتا رہے گا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ابتدا سے ہی اس منہج اور راستے کو اختیار کیا جائے جس پر چلنے والے کے لیے نجات کا وعدہ ہے اور وہ راستہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے، جو اس راستے پر چلے گا، اسے کسی بھی مرحلے میں کسی بھی حوالے سے کوئی شک نہیں ہوگا، بلکہ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا رہے گا، اس کے یقین میں مزید اضافہ پختگی آتی جائے گی، جس کے سبب وہ اپنے دل میں خوشی وراحت محسوس کرے گا اور خوب دل لگا کر محنت کرے گا، کبھی سستی وکاہلی کا شکار نہیں ہوگا۔

اصل اہل السنۃ والجماعۃ کو پہنچاننے کی کسوٹی

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس زمانے میں اپنے آپ کو اہل السنۃ والجماعۃ کے متبعین باور کرانے والے بھی بہت سے فرقے ہیں، ان میں سے اصل اہل حق کا امتیاز کس طرح ممکن ہے؟

یہ سوال بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا اور انہیں پریشان کیے رہتا ہے تو جان لیجیے کہ زبانی دعویٰ سے کچھ نہیں ہوتا، اس امتیاز کے لیے ہمارے پاس کسوٹی رسول کریم ﷺ کا ایک فرمان ہے، جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اصل اہل السنۃ والجماعۃ کون ہیں اور اہل بدعت وخواہش پرست کون ہیں۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد

ترجمہ: ''جس نے ہمارے دین میں کسی ایسی بات کو ایجاد کیا جو اس دین میں سے نہ ہو تو وہ مردود ہے۔'' (صحیح البخاری: کتاب الصلح)

جن لوگوں کے ہاں بدعتیں دین کا حصہ بن گئی ہوں، سمجھ لیجئے کہ وہ غلط ہیں وہ اہل السنۃ والجماعۃ نہیں ہو سکتے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

من غرس الحنظل لا يرتجي

ان يجتني السكر من غرسته

یعنی: جس نے اندرائن کا پودا لگایا تو یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے بوئے ہوئے پودے سے کوئی میٹھا پھل چن لے گا، بلکہ اندرائن کے کڑوے کسیلے پھلوں سے ہی اسے اپنا دامن بھرنا پڑے گا۔

خلاصہ یہ کہ اپنے آپ کو شکوک وشبہات اور اوہام وخیالات کی گہری کھائی سے نکالنے کے لیے قرآن وسنت کے بتائے ہوئے منہج اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، جس سے مسلمان کسی منزل پر نہ حیران و پریشان ہوگا اور نہ اسے اپنے کئے ہوئے سابقہ اعمال پر کبھی ندامت کا سامنا ہوگا، بلکہ وہ زندگی بھر ایک مضبوط رسی کو تھاما ہوا ہوگا، جو کبھی نہیں ٹوٹے گی۔

یہی ہمارے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بتایا ہوا راستہ ہے، ہمیں اسی پر چلنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورۃ الحشر:7)

ترجمہ: ''اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو جس چیز سے منع کریں، اسے رک جاؤ۔''

(8) اعتدال اور میانہ روی

اللہ جل جلالہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا التحیات والصلوات کے بارے میں فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً (سورة البقرة: 143)

ترجمہ:''اور (مسلمانو!) اس طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔''

تو امت وسط یعنی درمیانی امت ہونا اس امت کا خاص وصف ہے، جیسا کہ امت خیر یعنی بہترین امت ہونا اس کا خاصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (سورة آل عمران: 110)

ترجمہ:''(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔''

اس امت کے درمیانہ ہونے کا تعلق جس طرح عقیدے و نظریات سے ہے، اسی طرح اعمال کے ساتھ بھی ہے، لیکن جو لوگ میانہ روی اور اعتدال کے راستے کو چھوڑ کر غلو اور شدت سے کام لیتے ہیں، وہ عنقریب سستی و کاہلی کا شکار ہو جائیں گے۔

خاص کر کے عبادات یا طلب علم میں غلو سے کام لینا یا دعوت الی اللہ میں اعتدال کے راستے کو چھوڑ کر غلو اور شدت پسندی کا شکار ہونا، وغیرہ۔ اس سے انسان بہت جلدی تھک جاتا ہے، جس کے بعد لازماً وہ سستی و کاہلی میں مبتلا ہو جائے گا۔ سستی کے اسباب کے بیان میں اس پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔

قرآن وسنت کی بے شمار نصوص میں میانہ روی اور اعتدال کے راستے کو اپنانے کا حکم دیا گیا ہے، شدت پسندی، غلو اور بے جا تکلف سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا (سورة البقرة:286)

ترجمہ:''اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (سورة الحج: 78)

ترجمہ:''اور اس نے تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

يٰأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (سورة النساء:171)

ترجمہ:''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔''

اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں، جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، اس حوالے سے احادیث مقدسہ بھی بے شمار ہیں، کچھ گزر بھی چکی ہیں، جیسے کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

غلو اور بے جا تکلف سے اپنے آپ کو بچاؤ

(1) و ایاکم و الغلو فی الدین فانما اهلك من كان قبلكم الغلو فی الدين (اخرجه النسائي: كتاب المناسك)

ترجمہ:''اپنے آپ کو دین میں غلو اور شدت پسندی سے بچاؤ، اس لیے کہ تم سے پہلے لوگوں کو اس دین میں غلو کرنے نے ہلاک کیا ہے۔''

دوسری جگہ سرکار دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

احب العمل الی اللہ ادومه و ان قل (صحیح البخاری. کتاب الرقاق)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو دائمی اور ہمیشہ ہو، اگرچہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

میانہ روی اور اعتدال کامیاب زندگی کا بنیادی اصول ہے، دین اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لیے میانہ روی اور اعتدال کو اسلام میں بہت اہمیت دی گئی ہے، جو شخص اعتدال کا دامن تھامے رکھے گا وہ ہر قسم کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے محفوظ رہے گا، اس کی برکت سے مسلمان کے اندر مشکلات اور آزمائشوں سے مقابلہ کرنے کی قوت اور قدرت پیدا ہو جائے گی۔

ایسا شخص ہر شرعی حکم کو اس کے تمام تقاضوں کے مطابق انجام دے گا، وہ حالات اور موقع محل کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہوگا، بغیر کسی کمی کوتاہی کے دینی تقاضوں کو پورا کر سکے گا، اس حوالے سے وہ کسی اضطراب اور پریشانی کا شکار نہیں ہوگا، اسے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی سمجھ عطا فرمائے گا اور رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ اسی شخص کو عطا کرتا ہے، جس کے ساتھ وہ بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ (بخاری شریف)

رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت بھی اسی نہج پر فرمائی ہے کہ وہ زندگی بھر میانہ روی اور اعتدال کا راستہ اختیار کریں، آنے والی احادیث پر غور فرمائیں:

رہتی دنیا تک کے لئے میانہ روی اور اعتدال پسندی اپنانے کی ایک مثال

(2) امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک قریشی خاتون سے شادی کی تھی، لیکن اپنی عبادات روزے اور نمازوں کی وجہ سے وہ بیوی کو وقت نہیں دیتے تھے۔

جس سے بیوی کے حقوق کی ادائی نہیں ہوتی تھی، تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کا ذکر جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا:

''ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھا کرو'' انہوں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اضافہ کرتے رہے اور عبداللہ یہی کہتے رہے کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، یہاں تک کہ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو'' اسی طرح تلاوت قرآن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''ہر مہینے میں ایک بار قرآن ختم کیا کرو'' انہوں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر پندرہ دن میں ایک بار ختم کیا کرو'' انہوں نے کہا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر ہفتے میں ایک بار ختم کیا کرو۔'' انہوں نے پھر اپنی وہی بات دہرادی یہاں تک کہ آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر تین دن میں ایک بار ختم کیا کرو۔'' (صحیح البخاری: کتاب الصوم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو میانہ روی اور اعتدال پسندی کا ایک سبق

(3) حدیث میں ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قصہ مشہور ہے، جنہوں نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خفیہ عبادات کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے ان حضرات کو اس حوالے سے تفصیل بتادی۔

انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو گویا کم سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں ہم اور کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرما دیئے ہیں،

(اس لیے ہمیں عبادات میں زیادہ محنت کرنی پڑے گی) ان میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو آج سے ہمیشہ پوری پوری رات نمازیں پڑھتا رہوں گا۔

دوسرے نے کہا کہ میں سال بھر روزہ رکھوں گا کبھی افطار نہیں کروں گا، تیسرے نے کہا کہ ہمیشہ عورتوں سے دور بھاگوں گا، کبھی شادی نہیں کروں گا، تینوں حضرات یہ گفتگو کر ہی کر رہے تھے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ''تم نے یوں یوں کہا!!

لیکن اللہ پاک کی قسم! میں تو تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم سے زیادہ متقی ہوں، لیکن اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور خواتین سے شادیاں بھی کی ہیں، (سن لو) ''فمن رغب عن سنتي فليس مني'' جس نے میری سنت سے روگردانی اختیار کی تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (کتاب الغلو لعبد الرحمن اللویحق)

(9) وقت کی پابندی اور نفس کا محاسبہ

تمام امور کی بحسن وخوبی انجام دہی میں نظام الاوقات کی پابندی کا بہت بڑا دخل ہے، اپنے متفرق امور کے لیے ٹائم ٹیبل مقرر کرنے سے بہت آسانی ہوجاتی ہے، یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچوں نمازوں کے لیے مخصوص وقت مقرر کیا ہے، اگر مقررہ اوقات کی پابندی نہ ہوتی تو جماعت کا اہتمام نہ ہوتا۔

جسے جو وقت ملے اس میں نماز پڑھتا اور اگر وقت نہ ملے تو قضا بھی ہوتی اور بہت سے لوگ فارغ وقت کے انتظار میں نمازوں کو مؤخر کرتے، یوں کوئی ڈسپلن اور نظام نہ ہوتا۔ اس لیے نظام الاوقات اور ٹائم ٹیبل بہت ضروری اور اہم چیز ہے، اس سے ہر کام کو آسانی کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے، کچھ ہی عرصے میں انسان ایک نظام کا عادی ہوتا ہے، اس کے بعد پھر اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوتا۔

اسی طرح روزے کے حوالے سے بھی شریعت مطہرہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا ہے، اگر اس کی پابندی نہ ہوتی، رمضان روزوں کے لیے مقرر نہ ہوتا، بلکہ یہ حکم ہوتا کہ تیس دن کے روزے رکھو، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس اہم فریضے کی ادائی میں لوگوں کی کیا حالت ہوتی، بیشتر روزہ ہی نہ رکھتے، یا مؤخر کرتے رہتے اور زندگی گزر جاتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مہینے کو روزوں کے لیے مقرر کرلیا ہے، اسے دیگر مہینوں سے امتیازی حیثیت دی گئی ہے، دنیا بھر کے مسلمان سال بھر اس مہینے کی آمد کا منتظر رہتے ہیں، وہ شوق ورغبت سے دنوں اور مہینوں کو گنتے رہتے ہیں کہ کب رمضان

شریف آئے گا، اسی طرح حج وغیرہ...... اکثر شرعی امور کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام الاوقات کی پابندی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اگر مسلمان نظام الاوقات کی پابندی کا عادی ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کے وقت میں عجیب برکت ڈالتا ہے، جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، وہ اپنے کام اور عمل میں مزید چست اور چاک و چوبند ہوتا چلا جائے گا۔

یہاں تک کہ اس ٹائم ٹیبل کے خلاف کام کرنا اس پر گراں گزرے گا، ایک گھنٹہ یا منٹ بھی ضائع ہو جائے تو اسے دکھ ہوگا، جب اس کی یہ کیفیت ہو جائے تو وہ پورا دن یا مہینہ یا سال کیسے ضائع کر سکتا ہے، جبکہ وہ ایک منٹ کو ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، یا یہ کہ وہ کسی اہم کام کو سال یا مہینہ یا ہفتے تک کیسے موخر کر سکتا ہے جبکہ ایک منٹ کی تاخیر بھی اسے گوارا نہیں، یہ تبدیلی اس کے اندر کیسے آئی، یہ سب ٹائم ٹیبل کی پابندی اور نظام الاوقات کا خیال رکھنے کی برکت ہے۔

اگر آپ اپنے اسلاف کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو وقت کی پابندی کی عجیب وغریب مثالیں دیکھنے کو ملیں گی، یہی تو وجہ ہے کہ ان حضرات نے انتہائی مختصر وقت میں دین کا اتنا بڑا کام کیا جس کے لیے صدیاں درکار ہیں، انہوں نے کتابوں کی صورت میں بہت بڑا علمی ذخیرہ ہمارے لیے محفوظ کیا ہے۔

جو بلاشبہ اس امت پر احسان عظیم ہے۔ یہ اسی لیے ممکن ہوا کہ ایک تو ان حضرات کے اندر تقویٰ تھا، دوسرا وہ وقت کی بہت زیادہ پابندی کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ

ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے تھے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

حاسبوا قبل ان تحاسبوا

یعنی: ''اپنے نفس کا خود محاسبہ کیا کرو قبل اس کے کہ تم سے محاسبہ کیا جائے۔''

ان حضرات نے دنیا کی تاریخ میں اَن مٹ نشان چھوڑے ہیں، وہ راتوں کو عبادت اور دن کو شہسواری کرتے تھے، ان کی لغت اور ڈکشنری میں سستی و کاہلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، بے حسی اور کمزوری کا کبھی ان کے قریب سے گزر تک نہیں ہوا تھا۔

(10) جماعت کو لازم پکڑنا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جب فتنے سر اٹھائیں گے تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں کہ میں اس وقت کیا کروں اور کس طرح ان فتنوں سے بچ جاؤں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تلزم جماعة المسلمين و امامهم (صحیح البخاری، کتاب الفتن)

ترجمہ: ''تم مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کو لازم پکڑو۔''

ایک اور حدیث میں اپنی امت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

عليكم بالجماعة و اياكم و الفرقة فان الشيطان مع الواحد و هو الا ثنين ابعد من اراد بحبوحة الجنة فليلزم الجماعة

ترجمہ: ''تم (مسلمانوں کی) جماعت کو لازم پکڑو، اور اپنے آپ کو تفرقہ بازی سے بچاؤ، اس لیے کہ اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے، وہ دو افراد سے کچھ دور ہوتا ہے، جسے جنت کے درمیانی حصے میں گھر چاہیے تو وہ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے۔'' (جامع الترمذی، کتاب الفتن)

مسلمانوں کی جماعت سے کون سی جماعت مراد ہے؟

اس کے علاوہ ایک اور حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

وآمركم بالسمع والطاعة و الهجرة و الجهاد و الجماعة فان من فارق الجماعة شبرا فمات الا كانت ميتته ميتة جاهلية

ترجمہ: ''میں تمہیں (اللہ ورسول ﷺ کی) بات سننے اور اطاعت کرنے، ہجرت کرنے، جہاد کرنے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہنے کا حکم دیتا ہوں، اس لئے کہ جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے ایک بالشت بھی دور نکلا اور وہ اس حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔'' (صحیح البخاری، کتاب الفتن)

یاد رکھیں، یہاں جماعت سے مراد کوئی خاص جماعت یا پارٹی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہے، تہتر فرقوں میں سے یہی فرقہ ناجی یعنی نجات پانے والا ہے، یہی طائفہ منصورہ یعنی وہ جماعت ہے جس کے ساتھ نصرت خداوندی کا وعدہ ہے، لیکن بعض نادان لوگ ان احادیث سے اپنی بعض خاص جماعتوں کی حقانیت کے لیے استدلال کرتے ہیں، لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے۔

اگرچہ وہ جماعتیں بھی اہل السنۃ والجماعۃ سے تعلق رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ بدعات اور غلط نظریات سے پاک ہوں، تاہم ان احادیث کا تعلق کسی خاص جماعت سے ہرگز نہیں ہے۔

مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنے اور ان میں سے صالح لوگوں کی ہم نشینی اختیار کرنے سے انسان بہت سے شرور اور فتن سے محفوظ ہو جاتا ہے، ان شرور میں سے ایک تو وہی سستی و کاہلی ہے، اس مرض سے نجات پانا اس لیے آسان ہوگا کہ نیک صالح مسلمان بھائی اعمال صالحہ میں اس کی مدد کریں گے۔

یہ بھی انہیں دیکھ کر اچھائیوں اور بھلائیوں کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا، اس لیے کہ ہم نشینی اور صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے، ان کی برکت سے اس کے اندر بھی ایسی روح پیدا ہوگی، جو اسے نیکیوں میں سبقت حاصل کرنے پر ابھارے گی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (سورۃ الحدید:21)

ترجمہ: ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان وزمین کی چوڑائی جیسی ہے۔''

جس طرح کوئی شخص دنیوی زندگی انسان اکیلا بسر نہیں کرسکتا، اسے گھر والوں، ماں باپ، بیوی بچوں اور دوست احباب کا تعاون ہر قدم پر درکار ہوتا ہے، اسی طرح دینی اور روحانی زندگی کا سفر بھی کوئی اکیلا طے نہیں کرسکتا، گوشہ نشینی اور عزلت، ہلاکت کے مترادف ہے، الا یہ کہ وہ آخری زمانہ آجائے۔

جس میں شریعت نے خود گوشہ نشینی اور جنگل میں رہنے کو دین وایمان کی حفاظت کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے، اس وقت گوشہ نشینی شریعت کا حکم ہے، لیکن ہمارے زمانے میں ابھی وہ وقت نہیں آیا، اس لیے اب مسلمانوں کے ساتھ رہنے میں ہی عافیت ہے، حدیث میں آیا ہے کہ بھیڑیا اسی بکری کو کھاجاتا ہے جو ریوڑ کو چھوڑ کر کہیں دور نکل جائے۔ مسلمانوں کی جماعت بھی ریوڑ کی طرح ہے اور شیطان بھیڑیا اور اس کا دشمن ہے۔

(11) کاہلوں پر محنت

بہت سے سارے دینی طلبہ اور داعی حضرات کا یہ وتیرہ بن گیا ہے کہ جب ان کا کوئی ساتھی سستی میں مبتلا ہو جائے تو یہ حضرات فوراً اس کو چھوڑ دیتے ہیں، اس سے ملنا جلنا بند کر دیتے ہیں، تعلقات کو منقطع کر دیتے ہیں، جس کے سبب وہ مزید سست اور کاہل ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بالکل ہی راہ راست سے ہٹ جاتا ہے، وہ ادھر ہلاک ہو رہا ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھیوں کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، یہ شکایت آج کل بہت زیادہ سامنے آ رہی ہے۔ جو کہ انتہائی تکلیف دہ صورتحال ہے۔

اس لیے دین کا کام کرنے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں پر نظر رکھیں، اگر کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ سستی کے اعصاب پر سوار ہونا چاہتی ہے، یا ہو چکی ہے تو اسے چھوڑنے کے بجائے اس پر محنت کریں، بار بار اس کے پاس جائیں، اس کی ہمت باندھنے کی کوشش کریں، اس کی کمر کس کر اسے دوبارہ میدان عمل میں اتاریں، اسے اللہ سے ڈرائیں۔

ان اسباب کو تلاش کریں، جس کے سبب وہ سست پڑ گیا ہے، پھر انہیں دور کر دیں، اسے کوئی مشکل درپیش ہو تو اسے حل کریں، اگر کسی برے شخص کی ہم نشینی اس نے اختیار کی ہے، جس کے سبب وہ دینی کاموں میں سستی کا مظاہرہ کر رہا ہے تو اسے ان برے دوستوں کی صحبت سے بچائیں، یہ اس وقت تک اپنی کوششیں جاری رکھیں جب تک کہ پرنالہ وہیں نہ گرے جہاں پہلے گرتا تھا، یعنی وہ پھر سے چست اور چاک و چوبند ہو کر دینی امور کی انجام دہی میں جت جائے۔

اسے راہِ راست پر لانے کی تمام کوششوں میں ان حضرات کو اپنے ساتھی کے ساتھ نرمی اور ہمدردی کا برتاؤ کرنا چاہیے، اس لیے کہ نرمی ایک ایسی چیز ہے، جس میں یہ پائی جائے اسے خوبصورت کردیتی ہے اور جس چیز سے دور ہوجائے اسے بد صورت کردیتی ہے، اسے کسی بات پر عار نہ دلائیں، اس کی کمی کوتاہی کا ذکر نہ کریں، کیونکہ اس سے وہ مزید ان سے دور ہوجائے گا، یعنی ہر کام مثبت انداز سے سرانجام دینا چاہیے۔

(12) کامل ومکمل تربیت

انسانی زندگی پر تربیت کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، اسی لیے تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

كُل مولود يُولد على الفطرة فابواه يهوّدانه او ينصّرانه او يمجّسانه

ترجمہ: ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (فطری طور پر وہ دین فطرت یعنی اسلام پر ہوتا ہے) لیکن اس کے والدین (اپنے دین کے مطابق اس کی تربیت کر کے) اسے یا تو یہودی بناتے ہیں، یا نصرانی بناتے ہیں، یا مجوسی بناتے ہیں۔'' (صحیح البخاری: کتاب الجنائز)

ہمارے زمانے میں دینی مدارس میں تعلیمی اداروں میں تربیت برائے نام رہ گئی ہے، اگر ہوتی بھی ہے تو ہر مدرسے نے الگ نہج اور طریقہ مقرر کر رکھا ہے، مدارس کے تربیتی طریقوں میں بہت زیادہ اختلاف دیکھنے میں آرہا ہے، بعض حضرات کسی ایک پہلو پر زور دیتے ہیں اور دوسرے پہلو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے اور بعض حضرات اس کے برعکس طرز عمل اپنائے ہوئے ہیں۔

لیکن تربیت کے حوالے سے بہترین طریقہ وہی ہے جس کی تعلیم ہمیں قرآن وسنت سے ملتی ہے، جس میں زندگی کے تمام اہم پہلوؤں میں طلبہ کی تربیت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، کسی اہم پہلو کو تشنہ چھوڑنے سے تربیت نامکمل ہوگی

قرآن وسنت کے بتائے ہوئے طریقے کو ہی کامل تربیت کہا جاسکتا ہے، جس سے انسان تمام حقوق کو ادا کرنے اور تمام شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

بہر حال کامل تربیت ایک ایسا جوہر ہے جس سے انسان کے اندر ایک قوت پیدا ہوتی ہے، جس کے بعد وہ شخص کسی مرحلے میں بھی اضطراب اور پریشانی کا شکار نہیں

ہوگا، تمام اموراس کے سامنے بالکل واضح ہوں گے، ہر مستحق کواس کا حق ادا کرنے کے قابل ہوجائے گا، کسی شرعی امر کی بجا آوری میں وہ سستی وکاہلی کا شکارنہیں ہوگا۔

پھر اگر بچپن سے ہی بچے کی دینی تربیت کی جائے، اسے بچپن سے ہی تعلیم اور عبادات کا عادی بنادیا جائے تو یہ چیزیں اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں گی، وہ فطری طور پران چیزوں سے مالوف و مانوس ہوگا، اگر کسی وجہ سے وہ ان سے دور ہوجائے تو وہ طبعی طور پر بوجھ اور پریشانی محسوس کرے گا، یہاں تک کہ کسی بیماری کی وجہ سے وہ عبادت نہ کرسکے تو وہ غمگین ہوجائے گا۔

اس تربیت یافتہ شخص کے برعکس غیر تربیت یافتہ شخص تو معمولی معمولی اعذار کو بہانہ بنا کر عبادت سے جان چھڑائے گا، سفر درپیش ہو یا تھوڑی سی طبیعت خراب ہوجائے تو نماز یا دیگر عبادات کو چھوڑنے کا اسے ایک اچھا بہانہ مل جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ تربیت جتنی کامل اور بھرپور طریقے سے ہوگی، اس کا اثر بھی اسی طرح ظاہر ہوگا، اگر تربیت ناقص ہو تو پھر سستی وکاہلی آسانی سے انسانی اعصاب پر سوار ہوجائے گی۔ سستی سے بچاؤ کے لیے کامل تربیت میں مندرجہ امور کوملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے:

تربیت کرتے وقت ہر قسم کی نیکی پر ابھارنا چاہئے

(الف): بچے اور طالب علم کی تربیت کرتے وقت اس کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھادینی چاہیے کہ وہ ہر اچھے کام میں دوسرے سے آگے بڑھنے کا شوقین ہو، کسی اور کا اس پر سبقت لے جانے اسے کسی صورت گوارا نہ ہو۔ اس تربیت کا اس کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر مرتب ہوگا۔

تربیت کے وقت ذمہ داریوں کا بھرپور احساس دلایا جائے

(ب): اسے اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے، جوبھی ذمہ داری اس پر عائد ہوجائے وہ اسے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود کو ذہنی طور تیار وآمادہ کرلے، اس کے بعد وہ خود بخود عبادات اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کا خود کو پابند سمجھے گا اور بحسن وخوبی انہیں انجام دے گا۔

رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس نہج پر تربیت فرمائی تھی، انہیں اس بات کا پابند بنایا تھا کہ وہ دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے خود اعتمادی سے اپنے آپ کو ہی ذمہ دار سمجھتے تھے، حتیٰ کہ اس حوالے سے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آپ ﷺ نے بیعت بھی لی تھی جیسے کہ مسلم شریف میں حضرت ابو مسلم خولانی، حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے مندرجہ ذیل باتوں کی بیعت لی تھی:

ان تعبدوا الله و لا تشركوا به شيئا و الصلوات الخمس و تطيعوا و اسر كلمة خفيفة و لا تسألوا الناس شيئا (مسلم شريف: كتاب الزكاة)

یعنی: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، پانچوں نمازیں (ان کی پابندی کرو) اور (اللہ ورسول ﷺ) کی اطاعت کرو اور ایک بات آپ ﷺ نے چھپکے سے ارشاد فرمائی کہ کسی سے کوئی چیز مت مانگو۔''

امام نسائی نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

من يضمن لي واحدة و له الجنة ع الا يسأل الناس

ترجمہ: ''جو مجھے صرف ایک بات کی ضمانت دے اس کے لیے جنت ہے، (اس بات کی ضمانت دے) کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا۔''

(ابو داؤد: کتاب الزکاۃ و ابن ماجہ: کتاب الزکاۃ)

ان احادیث مبارکہ میں اگرچہ لوگوں سے مال مانگنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے بہت عام رکھا۔

انہوں نے ہر چیز کے حوالے سے خود کو سوال سے دور رکھا، یا یہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیئے ہوئے وعدے اور بیعت کی لاج رکھتے ہوئے سوال کو بالکل ہی چھوڑ دیا، حتیٰ کہ ان کی یہ کیفیت تھی کہ جب ان میں سے کسی کا کوڑا ابھی سواری سے نیچے گرتا تو وہ خود نیچے اتر کر اسے اٹھا لیتے تھے، کسی سے یہ کہنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے کہ وہ کوڑا اٹھا کر انہیں پکڑا دے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل تربیت کا نتیجہ ہے۔

(13) عبادت اور عمل میں تنوع

یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ جمود سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، ایک ہی طریقہ اور ایک ہی عمل کو بار بار دہرانے اور اسے تبدیل نہ کرنے سے وہ بور ہو جاتا ہے، انسان کو تنوع اور تجدد (یعنی نئے نئے طریقے) فطری طور پر پسند ہے، پھر فطرت کے مطابق کام کرنا شریعت کو مطلوب ہے۔

رسول کریم ﷺ اس کا بہت خیال رکھتے تھے، آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہمیشہ وعظ و نصیحت سے تربیت کرتے رہتے تھے تاکہ وہ عبادات سے بور یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہر روز اپنے شاگردوں کو اس لیے احادیث نہیں سناتے تھے تاکہ کہیں وہ اس استمرار اور ہمیشگی کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہفتے میں صرف ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو بار خطبہ دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ بور نہ ہو جائیں۔

معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز کو بار بار دہرانا انسانی طبیعت پر گراں گزرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئے تجدید و تنویع سے کام لیتے رہنا چاہیے، اس سے طبیعت میں نشاط اور چستی پیدا ہوتی ہے، ایک طریقے کو کچھ عرصے کے بعد تبدیل کر کے نیا طریقہ اپنانا چاہیے، بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک عمل کو مسلسل کرتے ہوئے تھکاوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پھر جیسے ہی کوئی نیا عمل شروع کرتے ہیں، تو پھر سے چست اور چاک و چوبند ہو کر اسے انجام دیتے ہیں، اس سے ان کے عزم و ہمت میں بھی مضبوطی آتی ہے اور

انہیں رغبت اور لذت بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن ایک ہی عمل میں لگے رہنے والوں کی ہمت بسا اوقات جواب دے جاتی ہے اور اس عمل سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور بالآخر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

تربیت ہو تو ایسی ہو

رسول کریم ﷺ نے اپنی امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ جب وہ کسی ایک عمل سے تھک جائیں تو اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا ایسا عمل شروع کر دیں، جس کی وہ طاقت رکھتے ہیں۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں ایک حدیث ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہتے ہیں کہ میں نے دربار رسالت میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کونسا عمل سب سے افضل ہے؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الایمان باللہ و الجِہاد فی سبیلہ

یعنی اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں عرض کیا: کونسی گردن سب سے افضل ہے (جس کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب ملے)؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انفَسُھا عند اھلھا و اکثرُھا ثمنا

یعنی جو اپنے مالک اور آقا کے نزدیک سب سے زیادہ نفیس اور عمدہ ہو اور اس کی قیمت سب سے زیادہ ہو۔

میں (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: ''اگر میں ایسا نہ کر سکا، (اور اتنا نفیس اور

مہنگا غلام آزاد نہ کر سکا تو کیا کروں)؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تعین صانعا او تصنع لاخرق

یعنی: ''کسی کاریگر کے ساتھ (اس کے کام میں) تعاون کرو یا کسی اناڑی اور غیر ہنر مند کے لیے کوئی (ایسا) کام کرو (جو اس کو نہیں آتا اور تم اس کام کے ماہر اور کاریگر ہو)۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اگر میں کچھ کاموں کو خود کرنے سے عاجز ہوا، یعنی خود نہ کر سکا تو آپ کیا حکم فرمائیں گے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تکف شرك عن الناس فانها صدقة منك علی نفسك

یعنی: ''(کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کر ہی لو کہ) لوگوں کو اپنے شر اور تکلیف سے بچاؤ، یہ تمہاری طرف سے تمہاری جان کا صدقہ ہے۔'' (صحیح مسلم، 1/86، 84)

اسی طرح بے شمار احادیث میں آیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خیر کے کاموں میں ہمت باندھنے اور انہیں آگے بڑھانے کے لیے مختلف مواقع پر مختلف ارشادات فرماتے رہے ہیں۔

جیسا کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ذهب اهل الدثور بالاجور

یعنی: ''(اسلامی) سرحدات میں پہرے دینے والے اور ان کی حفاظت کرنے والے سارا اجر وثواب لے اڑے۔'' (صحیح البخاری: کتاب الاذان)

مختلف امور کے فضائل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ مسلمان کے سامنے

اجر وثواب والے کئی اعمال ہوں اور وہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے میں لگ جائے یوں وہ کسی ایک کام میں لگا رہنے کی وجہ سے تھکاوٹ اور اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوگا، جس کے بعد سستی وکاہلی طاری ہو جاتی ہے۔

تنوع اور تجدید کے ساتھ ساتھ ثابت قدمی بھی ضروری ہے

لیکن یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ تنوع اور تجدید اس طرح نہ ہو کہ اس کی وجہ سے انسان کسی عمل میں ثابت قدم نہ رہ سکے، ایک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے دوسرا کام شروع کردے، اسے ادھورا چھوڑ کر تیسرا شروع کردے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، اس قسم کا تجدد وتنوع بجائے فائدہ مند ہونے کے انتہائی نقصان دہ ہے۔

یہ سستی کا علاج نہیں، بلکہ سستی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے، جیسا کہ پہلے اس پر بات ہو چکی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے قرآن کریم میں مکہ مکرمہ کی اس دیوانی عورت کی مثال بیان کی گئی ہے، جو دن بھر سوت کاتتی تھی، پھر اسے توڑ پھوڑ کے رکھ دیتی تھی۔

اس لیے اعمال وعبادات میں تنوع وتجدد اس طریقے کا ہونا چاہیے، جس سے مسلمان کو فائدہ ہو، تجدد کا مطلب یہ ہے کہ وقتی طور پر ایک کام سے اکتانے کے بعد دوسرا کام شروع کردیا جائے، تاکہ اکتاہٹ ختم ہو، یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے ضروری کام کو سرے سے بالکل ہی چھوڑ دیا جائے۔

اور پھر کبھی اس کی طرف رجوع نہ کیا جائے، بلکہ اکتاہٹ کے ختم ہونے کے بعد پھر اس کام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس کی مثال ایسے ہی جیسے کہ کوئی مسلمان حرم شریف میں ہے، راتوں کو عبادت کرتا رہتا ہے، نمازیں پڑھتا رہتا ہے، لیکن جب نماز سے کچھ تھکاوٹ ہو جائے تو قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دیتا ہے، یا بیت اللہ کا طواف شروع کر دیتا ہے، یا اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے، پھر جب تھکاوٹ ختم ہو جائے تو سابقہ عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دیگر عبادات بھی ایسی ہی ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھیں کہ تجدد یا نیا عمل شروع کرنے کا تعلق ان عبادات کے ساتھ ہے، جو فرض یا واجب نہیں ہیں، مثلاً نماز یا رمضان شریف کے روزے فرض ہیں، انہیں کسی حال میں بھی نہیں چھوڑا جا سکتا، سستی دور کرنے کے لیے کوئی ذی ہوش یا عقل مند شخص یہ فتویٰ نہیں دے سکتا کہ کچھ دن کے لیے فرض نمازیں چھوڑ دی جائیں یا ایک آدھ رمضان کے روزے ترک کر دیئے جائیں، انہیں ہر حال میں بجالانا ہے، کسی صورت بھی ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

اس حوالے سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اپنے فضل و کرم سے اس کے لیے نجات کا راستہ نکال ہی لیتا ہے، اسی طرح وہ بفضل خدا سستی و کاہلی سے بھی نجات پائے گا۔

معلوم ہوا کہ تجدد کا تعلق مستحبات یا نوافل کے ساتھ ہوتا ہے، پھر یہ بھی یاد رہے کہ مستحبات یا نوافل میں بھی وہ نئی عبادت یا طریقہ اپنانا چاہیے، جس سے سستی و کاہلی ختم ہو، ورنہ فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔

(14) صالح پیشوا یا گریٹ آئیڈیل

کسی صالح اور بڑی شخصیت کو اپنا پیشوا اور اپنے لیے آئیڈیل یا نمونہ بنانا فائدے سے خالی نہیں ہے، اپنی آئیڈیل شخصیت کی زندگی اور اس کی قربانی اور محنتوں کو دیکھ کر انسان کے عزم و ارادے بلند ہو جاتے ہیں، اس کے لیے مشکل سے مشکل کام سرانجام دینا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر کسی کی تقریر یا وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اسی طرح ترغیب و ترہیب ان کے لیے بے کار ہوتی ہے، لیکن جب ان کے سامنے کسی بڑی شخصیت کی قربانی و جدوجہد کا ذکر ہوتا ہے تو وہ فوراً اثر قبول کر لیتے ہیں، ان کے دل میں بھی اس جیسا بننے کا شوق انگڑائیاں لینا شروع کر دیتا ہے۔

مجھے جب بھی کہیں کسی موضوع پر خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس بات کو مدنظر رکھتا ہوں کہ اس موضوع سے متعلق پہلے قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کرتا ہوں، اس کے بعد اپنے زمانے کے مقتدر علماء و صلحاء کی مثال بھی ضرور بیان کرتا ہوں، مثلاً اگر وقت کی قدر دانی پر بات کرنی ہو تو پہلے قرآن و سنت کے دلائل بیان کرتا ہوں۔

اس کے بعد وقت کو قیمتی بنانے والے سلف صالحین کا کوئی واقعہ پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اپنے زمانے کی کسی اہم دینی شخصیت کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا ہوں کہ ان حضرات نے اپنے وقت کو کس طرح قیمتی بنایا، انہوں نے اپنا کوئی دن یا ہفتہ یا مہینہ تو دور کی بات ہے۔

ایک منٹ کو بھی ضائع ہونے سے بچایا، ان کی پوری زندگی محنت و جدوجہد اور

چستی ونشاط سے عبارت ہے، وہ ہمیشہ دینی کاموں، دعوتی امور اور طلب علم میں لگے رہتے ہیں، کبھی خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائی میں کوتاہی نہیں برتتے۔ میں اس لیے ان حضرات کو اپنا پیشوا اور آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ جب میں اس طرح گفتگو کرتا ہوں تو سامعین پر اس کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس لیے میں تمام داعی حضرات، مربیین اور خطباء کرام سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تقریر اور وعظ ونصیحت پر مبنی بیانات میں اس چیز کو ملحوظ نظر رکھیں۔ اس سے سامعین اور طلبہ بہت اچھا اثر لیں گے۔ اس کا فائدہ وہ خود بھی محسوس کریں گے۔

نیک اور باہمت لوگوں کو اپنا آئیڈیل اور پیشوا بنانے کی تعلیم ہمیں قرآن کریم سے بھی ملتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں انبیاء اور رسولوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

أُولَئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (سورۃ الانعام: 90)

ترجمہ: ”یہ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی، لہٰذا (اے پیغمبر!) تم بھی انہی کے راستے پر چلو۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زندگی کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ اور آئیڈیل قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب:21)

ترجمہ: ”حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔“

علماء صالحین زندگی کے حالات کا تذکرہ کرنے سے مسلمانوں کو ایک نیا جذبہ

ملتا ہے، ان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں، خاص کر کے اپنے زمانے کے صلحاء کا ذکر بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس سے سست و کاہل لوگ جاگ جاتے ہیں اور بے جا قسم کی تاویلیں بنانے اور بہانے تراشنے والوں کا منہ بند ہوجاتا ہے، جو یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں جناب! وہ رسول اللہ ﷺ کا یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ تھا۔

اس وقت حالات کچھ تھے اب کچھ اور ہیں، اب ایسے کام نہیں ہوسکتے، یہ تو فتنے کا زمانہ ہے، قرب قیامت ہے، وغیرہ وغیرہ...... جب موجودہ زمانے کے کسی صالح انسان یا عالم باعمل کی مثال پیش کی جائے گی تو وہ لوگ اس قسم کی تاویلیں اور بہانے نہیں بنا سکیں گے۔

کسی شاعر نے کیا خوب بات کہی ہے:

نعیب زماننا و العیب فینا

و ما لزماننا عیب سوانا

نجو ذ الزمان بغیر حق

ولو نطق الزمان بنا هجانا

ترجمہ: ''ہم زمانے کے اندر عیب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ عیب خود ہمارے اندر ہیں، زمانے کا عیب سوائے ہمارے وجود کے کچھ بھی نہیں ہے، (کہ بس ہم جیسے بے ہمت اور کمزور لوگ زمانے میں جی رہے ہیں یہ اس کا عیب ہے) ہم ناحق زمانے کو برا بھلا کہتے ہیں، اگر زمانے کے پاس زبان ہوتی اور وہ بول سکتا تو وہ ہمیں برا بھلا کہتا۔''

اس شاعر نے ایک اٹل حقیقت کو بیان کیا ہے، اس شعر اور اس کے ترجمے کو بار بار پڑھیں اور اس پر غور کریں تو حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''میں بہت سے مشائخ اور علمائے کرام سے پاس گیا اور ان سے علم حاصل کیا، ان میں سے ہر ایک کا حال دوسرے سے مختلف تھا، تاہم مجھے ان میں سے سب سے زیادہ فائدہ اس سے ہوا جو اپنے علم پر عمل پر کرتا تھا، اگرچہ اس کا علم دوسرے علماء کے مقابلے میں کم تھا۔

ان علمائے کرام میں سے ایک شیخ عبد الوہاب الانماطی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، ان کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی۔ ان کی مجلس میں، میں نے کسی کی غیبت نہیں سنی، وہ حدیث بیان کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے تھے، دوران تعلیم میں شیخ منصور الجوالیقی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی گیا، وہ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔

بہت غور و فکر کے بعد کچھ بولتے تھے، بسا اوقات میں نے دیکھا کہ ان سے کوئی آسان مسئلہ دریافت کیا جاتا، جس کا جواب کوئی عام طالب علم بھی فوراً دے سکتا ہے، مگر شیخ جوالیقی رحمۃ اللہ علیہ اس پر کافی غور و فکر کرتے اور اطمینان ہو جانے کے بعد ہی جواب دیتے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ میں نے ان دونوں حضرات سے جتنا استفادہ کیا، وہ ان کے علاوہ سینکڑوں اساتذہ سے زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص اپنے عمل سے دلیل قائم کرتا ہے اس کی بات قولی اور زبانی دلیل دینے والے شخص کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش اور دل نشین ہوا کرتی ہے۔'' (صید الخاطر: 443)

پیشوا اور آئیڈیل یا بہترین نمونے کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتوں کا اہتمام

کرنا مفید ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے عظام رحمۃ اللہ علیہم کی سیرتوں کا مطالعہ

انبیائے کرام اور رسولوں علیہم السلام کی سیرتوں (خاص کر کے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ) کے مطالعہ سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں، یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار انبیائے کرام علیہم السلام اور ان پر آنے والے حالات کا تذکرہ فرمایا ہے، اسی طرح احادیث مقدسہ میں بھی انبیائے کرام کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔

ان قصوں میں مومن کے لیے بہت بڑا سامان عبرت ہے، کہ وہ اپنی زندگی کا ان مقدس ہستیوں کی زندگی سے موازنہ کرے کہ ان پر کیسے کیسے حالات آئے، مگر انہوں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا، ہمت ہار کر نہیں بیٹھے اور نہ کبھی سستی و کاہلی کا شکار ہوئے۔

یہ ایک ایسا بہترین نسخہ ہے، جو مومن کو سستی و کاہلی سے نجات دینے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، وہ جب ان مقدس ہستیوں کے قصے پڑھے گا تو ضرور ان جیسا بننے کی کوشش کرے گا۔

اس لیے کہ ہر مسلمان کو قیامت کے دن ان حضرات کے ساتھ ہونے کی آرزو ہے اور ان کے ساتھ حشر اسی کا ہوسکتا ہے، جو ان کی اتباع کرے، اس لیے مومن کے لیے بھی صبر کرنا اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنا آسان ہو جائے گا۔

اسے دین کے راستے میں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے گی تو وہ فوراً یہ سوچے گا کہ مجھ سے افضل ہستیوں یعنی انبیائے کرام پر بھی سخت ترین حالات آئے ہیں، میری مشکلات ان کے عشر عشیر کے برابر بھی نہیں ہے، ان پر تو مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے تھے، میں جس مشکل کو مصیبت قرار دے رہا ہوں، اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، یہ

سوچتے ہی اس کے لیے صبر کرنا آسان تر ہو جائے گا۔

اگر دین کے راستے میں اسے کسی نے تکلیف دی تو سے فوراً یہ خیال آئے گا کہ کائنات کی افضل ترین شخصیات کو بھی اس راستے میں تکلیفیں دی گئی ہیں، تو میری کیا حیثیت ہے، اگر لوگوں نے اسے جھٹلایا تو وہ یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرے گا کہ مجھ سے افضل ہستیوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں کا مطالعہ ایک بہترین نسخہ ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی اتباع کرنے کا حکم دیا ہے، جیسے کہ سورۃ الانعام میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (سورة الانعام: 90)

ترجمہ: ''یہ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی، لہٰذا (اے پیغمبر!) تم بھی انہی کے راستے پر چلو۔''

انبیائے کرام کے قصوں اور ان پر آنے والے حالات کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا

(سورة الانعام: 34)

ترجمہ: ''اور حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے، پھر جس طرح انہیں جھٹلایا اور تکلیفیں دی گئیں، اس پر انہوں نے صبر کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی امت کے سامنے انبیائے کرام علیہم السلام کے قصوں کو بیان فرمائیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (سورۃ الاعراف: 176)

ترجمہ: ''لہٰذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو تاکہ یہ لوگ سوچیں۔''

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت کے ساتھ ساتھ سلف صالحین اور اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور حالات کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ خاص کر کے دین کی دعوت اور علم دین سے وابستہ حضرات کے لیے اس کی عجیب تاثیر ہے۔

بہت سے ایسے طلبہ یا داعی حضرات کو ہم نے دیکھا ہے کہ ان کے اعصاب پر سستی سوار ہوگئی اور ان کے سامنے ان حضرات کے حالات کا تذکرہ کیا گیا کہ انہوں نے دین پھیلانے یا علم دین کے حصول میں کیسی کیسی قربانیاں دیں اور کیسے کیسے مسائل سے دوچار ہوئے۔

مگر اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اپنے کام میں لگے رہے، بالآخر سرخرو ہو کر دنیا سے چلے گئے، اس قسم کے قصے اور حالات سننے کے بعد سستی و کاہلی یک لخت ختم ہو جاتی ہے، انسان چست اور چاک و چوبند ہو کر پھر سے اپنے کام میں جت جاتا ہے اور اپنے اندر ایک عجیب قوت محسوس کرتا ہے۔

چنانچہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے پاس علم کا اتنا بڑا ذخیرہ کیسے جمع ہوا؟ تو انہوں نے فرمایا: حاصل شدہ علم یا معلومات کو ناکافی سمجھتے ہوئے مختلف علاقوں اور ملکوں میں گھومنے پھرنے اور کوے کی طرح صبح سویرے جاگنے اور پتھر کی طرح صبر کرنے سے میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔

جب بھی کسی داعی یا طالب علم کو کوئی مشکل پیش آئے اور وہ اپنے اسلاف کے

حالات کو مدنظر رکھے تو اسے ایک روحانی طاقت حاصل ہو جائے گی، جیسے امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عز بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان جیسے ہزاروں علماء و صلحاء رحمۃ اللہ علیہم ایسے گزرے ہیں، جنہیں بلاشبہ دعوت و عزیمت کا روشن مینارہ قرار دیا جاسکتا ہے اور ان کی اتباع کرنے والا کبھی سستی و کاہلی کا شکار نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ حالات سے ڈر کر دین کا کام چھوڑ بیٹھے گا۔

ہمارے یہ اسلاف حقیقی معنوں میں قرآن کریم کی اس آیت کے مصداق ہیں:

وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (سورة آل عمران: 139)

ترجمہ: ''(مسلمانو!) تم نہ تو کمزور پڑو اور نہ غمگین رہو۔ اگر واقعی مومن رہو تو تم ہی سربلند رہو گے۔''

(15) عزم وہمت کی بلندی اور عزیمت پر عمل کرنا

انسان کو اپنے عزائم ہمیشہ بلند رکھنے چاہئیں، اس کا مقصد ناپائیدار اور گھٹیا دنیا کے بجائے آخرت ہونی چاہیے، دنیوی کامیابی کے بجائے اس کی نظر جنت الفردوس کے حصول پر ہونی چاہیے، مخلوق کی رضا کے بجائے اسے خالق کو راضی کرنے کی فکر ہونی چاہیے، جو شخص اس کوشش میں کامیاب ہوگیا، بس اس کا کام ہوگیا، وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اب اسے چاہیے کہ جب تک جسم میں جان ہے، اللہ کی عبادت کو لازم پکڑے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (سورۃ الحجر: 99)

ترجمہ: ''اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمہیں موت نہ آئے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں جنت میں آپ کا ساتھی بننا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا:

اعنی علی نفسك بكثرة السجود (صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ)

ترجمہ: ''تم اس حوالے سے میری مدد کے لیے اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ سجدوں (نمازوں) کو لازم کرلو۔''

جب انسان کا مقصد عالی اور اس کے ارادے بلند ہوں تو خود بخود وہ گھٹیا دنیا اور اس کی خواہشات سے منہ موڑے گا، وہ زہد کی زندگی اپنائے گا، وہ بس بقدر ضرورت دنیا کے حصول کے لیے محنت کرے گا، اس کا ذخیرہ کرنے کی کوشش نہیں کرے، اپنی زندگی کو وہ آخرت کی دائمی نعمتوں کے حصول کے لیے وقف کردے گا۔

یہی تو وجہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وقت کا خلیفہ بنے تو عیش و عشرت کے تمام لوازمات کو یکسر چھوڑ دیا، حالانکہ اس سے پہلے انہوں نے ایسی زندگی گزاری تھی، جس کی مثال ملنا مشکل ہے، دنیا کی تمام عمدہ اشیا اور عیش وعشرت کے تمام اسباب ہمہ وقت ان کے پاس موجود ہوا کرتے تھے، لیکن جب خلیفہ بنے تو ان کے ارادے بلند ہو گئے۔

انہوں نے عالی چیز کو زندگی کا مقصد بنا دیا، اب ان کی زندگی کی یکسر تبدیل ہو گئی، خلیفہ بننے سے پہلے ان کے پاس دنیا کے تمام عمدہ قسم کے کپڑے ہوا کرتے تھے، لیکن خلیفہ بننے کے بعد ایک ہی جوڑے پر گزارہ کرنے لگے۔

وہ بقدرِ ضرورت معمولی کھانا تناول فرمانے لگے، حالانکہ مال و دولت کے ڈھیر ان کے قدموں پر پڑے رہتے تھے، ہر قسم کے پھل اور میووں کی ان کے پاس کمی نہیں تھی، مگر مجال ہے کہ ان دنیوی اشیا میں سے کسی کی طرف خلیفہ راشد نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ رحمہ اللہ۔

معلوم ہوا کہ عزائم و ارادوں کی بلندی سے انسان آخرت کی محنت کے لیے چست اور چاک وچوبند ہو جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر کسی کے ارادے اور عزائم پست ہوں، یعنی اس کا مطمع نظر گھٹیا دنیا ہو تو لازماً نیک اعمال میں وہ سستی و کاہلی کا شکار ہو جائے گا، جب نظر آخرت کی بڑی بڑی اور دائمی نعمتوں پر ہوگی تو دنیا کی ناپائیدار اور وقتی نعمتوں کی طرف انسان دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔

بلندی ہمتی کی ایک ظاہری علامت یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں عزیمت کا راستہ اختیار کرے، رخصتوں کو چھوڑ دے، محنت و مشقت کا خود کو عادی بنا دے، حق کے

لیے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا کر لے اور ہر وقت حق اور سچ کے کاموں میں خود کو لگا دے، اگر ایسا نہ ہو تو نفس خود بخود باطل کے پیچھے لگ جائے گا، کیونکہ وہ بے کار اور فارغ نہیں بیٹھ سکتا۔

واضح رہے کہ دین کے بہت سے امور میں شریعت کی جانب سے دو باتوں کا انسان کو اختیار دیا گیا ہے، ان میں سے ایک کو رخصت اور دوسرے کو عزیمت کہتے ہیں، مثلاً نفل یا سنت نماز بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں اور کھڑے ہو کر بھی، لیکن کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے اور یہی عزیمت ہے، جبکہ بیٹھ کر پڑھنا رخصت ہے، اس میں ثواب بھی کم ہے۔

اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو عزیمت کا عادی بنا دے، رخصتوں کو خوگر بننے والا نفس خود بخود سستی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، بلکہ رخصت پر عمل بھی سستی ہی کا نتیجہ ہے۔

(16) موت کو کثرت سے یاد کرنا اور برے خاتمہ سے ڈرنا

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

اکثروا ھازم اللذات الموت

ترجمہ: ''تمام لذتوں اور مزوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔'' (سنن نسائی: کتاب الجنائز، سنن ابن ماجه: کتاب الزھد)

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا، فانھا ترق القلب، وتدمع العین، و تذکر الآخرۃ

ترجمہ: ''میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، سو اب ان کی زیارت کیا کرو، اس لیے کہ اس سے دل نرم، آنکھیں پرنم اور آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔'' (مستدرك حاكم: 376/1)

موت کو کثرت سے یاد کرنے اور اپنے برے انجام سے ہمیشہ ڈرنے سے نفس کے اندر خود بخود چستی پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ ڈرنے والا شخص کبھی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا کرتا۔ موت کو کثرت سے یاد کرنے سے سر دست تین فوائد حاصل ہوں گے:

(1): جلد از جلد توبہ کی توفیق ملے گی (2): دل میں قناعت کی صفت پیدا ہوگی (3): عبادت اور اعمال صالحہ کے حوالے سے نفس میں چستی اور محنت کا شوق پیدا ہوگا۔

جبکہ موت کو بھلا دینے سے انسان کو تین بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا:

(1): وہ جلد توبہ نہیں کر سکتا، وہ وقت ضائع کرتا رہے گا اور آج کل کرتے کرتے

زندگی گزر جائے گی، مگر توبہ اسے نصیب نہیں ہوگی۔

(2): وہ قناعت کی صفت سے خالی ہوگا، اس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کسی نعمت پر خوش نہیں ہوگا، بلکہ مزید کی جستجو میں لگا رہے گا، یوں ساری زندگی اس فکر میں گزار دے گا۔

(3): وہ عبادت میں سستی و کاہلی کا شکار ہوگا، موت کو چونکہ یاد نہیں کرتا، ہمیشہ یہی کہتا رہے گا کہ اب میں نے تھوڑا ہی مرنا ہے، بعد میں موقع ملے گا تو عبادت کروں گا۔

برے خاتمے کے انجام سے غفلت

سوء خاتمہ یعنی اپنے برے انجام کے حوالے سے زیادہ تر لوگ غفلت کا شکار ہیں، حالانکہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ایک آدمی پچاس سال تک جنتیوں والا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے اور اس کا خاتمہ جہنم والوں کے عمل سے ہو جاتا ہے۔'' (مسلم شریف)

مطلب یہ ہے کہ آخری وقت میں معمولی مقدار میں کوئی عمل کرے گا، لازمی بات ہے یہ معمولی عمل اعضاء و جوارح کا تو نہیں ہوسکتا، کیونکہ آخری وقت میں عمل کا کونسا وقت ہوتا ہے، بلکہ دل کے پاک اور صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی ایسی بات آئے گی جس سے اس کا ایمان موت کے وقت تباہ ہو جائے گا اور سوئے خاتمہ کا باعث بنے گا تو دل کا کیا بھروسہ ہے؟

جس انسان کو سوئے خاتمہ کا خطرہ ہمیشہ دامن گیر ہو تو اس کے دل میں لازماً خوف الٰہی پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ دل کی کیفیت بدلنے میں وقت نہیں لگتا لوگوں

کے دل تو رحمٰن کی انگلیوں کے درمیان میں ہیں اور وہ ان کو جس طرف چاہے پھیر دیتا ہے، اس لیے دل کے پھر جانے میں کوئی دیر نہیں لگتی، دلوں کو پھیرنے والے رب کا فرمان ہے:

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ (المعارج: 28)

ترجمہ: ''یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو۔''

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ کا برے خاتمے کے خوف سے رونا

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ آخری وقت میں زور سے رونے لگے، کسی نے کہا: حضرت! اللہ سے امید رکھیں، اس کی رحمت آپ کے گناہوں سے کہیں بڑھ کر ہے، فرمایا: میں اپنے گناہوں پر نہیں رو رہا، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا خاتمہ ایمان و توحید پر ہو جائے گا تو مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی کہ میں پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر اللہ سے ملاقات کروں۔

جب عارفین اور پہنچے ہوئے حضرات سوئے خاتمہ سے اس طرح خوف کھاتے ہیں تو ہم جیسے ضعیف اور بے عمل لوگوں کو نہیں ڈرنا چاہیے؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی دو کتابوں ''الداء و الدوا'' اور ''طریق الہجرتین'' میں بہت سے ایسے لوگوں کے قصے لکھے ہیں، جن کا آخر خاتمہ برا ہوا، ان کے سامنے کلمہ طیبہ کی تلقین کے باوجود وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' نہ پڑھ سکے، فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا دل دنیا کی محبت سے بھرا ہوا تھا، اس لیے ایسے برے انجام کو پہنچے۔

سکرات الموت اور روح قبض ہونے کی کیفیت میں مبتلا لوگوں کو دیکھنے سے بھی

سستی و کاہلی کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ سیدنا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عُوْدُوا الْمَرْضٰی وَاتَّبِعُوا الْجَنَائِزَ تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ

ترجمہ: ''بیماروں کی عیادت کیا کرو، جنازوں میں شرکت کیا کرو، یہ چیزیں تمہیں آخرت کی یاد دلائیں گی۔'' (مسند احمد)

موت کو کثرت سے یاد کرنا برے خاتمے سے بچاؤ کا ذریعہ ہے

بسا اوقات اس کا انسانی زندگی پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ تاحیات اسے نہیں بھول سکتا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ایک مرتبہ کسی ایسے مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے جو آخری حالت میں تھا، اس کی کیفیت کچھ زیادہ ہی کربناک تھی، حضرت نے اس کی عیادت کی اور باہر نکلے تو آپ کا رنگ متغیر ہوگیا تھا، اسی وقت آپ اپنے گھر لوٹے، گھر والوں نے کھانا پیش کیا۔

آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: اپنے کھانے پینے کا سامان اپنے پاس رکھو، میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا ہے، جو قریب الموت تھا اور سکرات الموت کی سختیوں نے اسے گھیر رکھا تھا، اب میں بھی اس وقت تک اس موت کی تیاریاں شروع کردوں گا، جب تک کہ مجھے بھی اس حالت سے دوچار ہونا پڑ جائے۔ (التذکرۃ: ص 17)

خلاصہ یہ کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور اپنے خاتمہ کے حوالے سے ہمیشہ فکرمند رہنا انسان کو سستی و کاہلی جیسی مہلک بیماریوں سے نجات دلانے میں بہت مفید ہوا کرتا ہے۔

(17) ہمت سے کام لیتے ہوئے صبر کرنا

علم دین، عبادت اور دعوت الی اللہ کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں سے بھری راہ گزر ہے، اس میں قدم قدم پر مصائب و مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے، چونکہ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا راستہ ہے اور اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ مصائب انبیاء کرام علیہم السلام پر آئے ہیں۔

حدیث کا مفہوم ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام کے جتنا قریب ہوگا، اسے اتنے ہی مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دنیا کی معمولی چیز بھی محنت و مشقت برداشت کئے بنا نہیں ملتی، تو پھر جنت کی دائمی و ابدی نعمتوں کے حصول کے لیے بھی مشکلات اور مشقتوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ

ترجمہ: ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا کہ بس وہ یہ کہہ دیں کہ: ''ہم ایمان لے آئے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے؟'' (سورۃ العنکبوت: 2،1)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (سورۃ آل عمران: 142)

ترجمہ: ''بھلا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (یونہی) جنت کے اندر جا پہنچو گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے لوگوں کو جانچ کر نہیں دیکھا جو جہاد کریں اور نہ ان کو جانچ کر دیکھا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔''

راہ حق پر ثابت قدم رہنے میں صبر کا بہت بڑا عمل دخل ہے، گمراہی اور فسق و فجور سے بچنے میں بھی صبر ہی مدد ومعاون ہے، اسی طرح سستی و کاہلی سے نجات دلانے میں بھی صبر بہت بڑی تاثیر رکھتا ہے، اس لیے بے شمار آیات و احادیث میں صبر کی اہمیت و فضیلت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ان تمام آیات و احادیث کو اس مختصر رسالے میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے ہم کچھ آیات اور رسول اکرم ﷺ کے فرامین کا تذکرہ کر کے صبر کی اہمیت و فضیلت کی طرف اشارہ کریں گے۔

صابرین کے اوصاف اور ان کے صبر کا ثمرہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نوے سے زیادہ مقامات میں صابرین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں اور بہت سے عالی مقامات و درجات کے حصول کو صبر کا ثمرہ قرار دیا ہے، فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا (سورة السجدة: 24)

ترجمہ: ''اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: ''اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔'' (سورة النحل: 96)

ارشاد ربانی ہے:

اُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (سورۃ القصص: 54)

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دوبارہ دیا جائے ان کے صبر کرنے کے بدلے میں۔''

اللہ عزوجل کا فرمان عالی شان ہے:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورۃ الزمر: 10)

ترجمہ: ''صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

ہر نیکی کا اجر و ثواب حساب اور مقدار کے مطابق ملتا ہے سوائے صبر کے کہ اس کا اجر بلاحساب ملتا ہے، روزہ میں بھی صبر ہوتا ہے، اس لیے اس کا اجر بہت ہی زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاصْبِرُوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ (سورۃ الانفال: 46)

ترجمہ: ''اور صبر سے کام لیا کرو بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

پانچ انعام صرف صابرین کے لیے ہیں، کسی اور کے لیے نہیں، ارشاد فرمایا:

اُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَّ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ

ترجمہ: ''انہیں خوشخبری دے دو، ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔'' (سورۃ البقرۃ: 157)

اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے:

نِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا (سورۃ العنکبوت: 59)

ترجمہ: ''عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کیلئے جنہوں نے صبر کیا ہے۔''

یعنی نیک عمل کو مکمل کرنے تک صبر کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کے ذریعے سے مدد حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (سورة البقرة: 45)

ترجمہ: ''اور صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے محترم نبی ﷺ کو کفار کی جانب سے پیش آمدہ تکالیف پر صبر کی تلقین فرمائی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَدَعْ اَذَاهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (سورة الاحزاب: 48)

ترجمہ: ''ان کی اذیت رسانی کی کوئی پروا نہ کرو اور بھروسہ کرو اللہ پر۔''

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِيْلاً (سورة المزمل:10)

ترجمہ: ''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔''

صبر کرتے ہوئے اپنے حقوق کو معاف کر کے قصاص نہ لینے والوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (سورة النحل: 126)

ترجمہ: ''اور اگر تم لوگ بدلہ لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔''

اللہ تعالیٰ مصیبت پر صبر کرنے سے نعم البدل عطا فرما دیتے ہیں

رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''جس مومن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اس نے وہی کہا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے یعنی ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اے اللہ میری مصیبت پر مجھے اجر عطا فرما اور اس کا مجھے نعم البدل عطا فرما تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی کرتا ہے، یعنی اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' (صحیح مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! اس بندے کی کیا جزا ہے جس کی دو محبوب چیزوں (آنکھوں) کو میں چھین لوں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: تیری ذات پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کی جزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے گھر (جنت) میں رہے اور میرا دیدار کرتا رہے۔'' (بخاری شریف)

نیکوکار انسان کو اطاعت میں تین مراحل پر صبر کرنا پڑتا ہے، جن میں سے ایک مرحلہ یہ کہ نیکی سے پہلے ہی صبر کرے، یعنی اپنی نیت کو درست کرنے اور ریا کے شائبہ سے اسے دور کرنے میں صبر سے کام لے، پھر ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں صبر کا مظاہرہ کرے، اس کے بعد نیکی کرنے کا عزم مصمم کرلے، ریا ایک مہلک چیز ہے، اس سے اپنے عمل کو بچانا بہت مشکل کام ہے، اسی لیے رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی (بخاری و مسلم)

ترجمہ: تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (سورۃ البینۃ: 5)

ترجمہ: ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔''
اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صبر کو عمل پر مقدم کر کے فرمایا:
اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سورۃ ھود: 16)
ترجمہ: ''مگر جو لوگ صبر سے کام لیتے رہے اور نیک کام کرتے رہے۔''
مذکورہ بالا آیات اور احادیث سے صبر کی فضیلت بخوبی واضح ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ مومن کو دینی کاموں کی انجام دہی میں ہر لمحے صبر کا دامن تھامے رکھنا چاہیے، چاہے وہ دین کی دعوت کا کام ہو یا علم دین کے حصول کی محنت ہو یا عبادت۔
یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ سستی و کاہلی کو ختم کرنے میں انبیائے کرام، اولیائے عظام اور سلف صالحین کی سیرت کا مطالعہ بہت مفید ہے، اسی طرح حصول صبر کرنے میں ان کی سیرت کا مطالعہ معاون ثابت ہوتا ہے۔
انبیائے کرام علیہم السلام نے دین کی دعوت اور اسے پھیلانے میں کتنی مشقیں برداشت کیں اور انہیں اس راستے میں کتنا ستایا گیا، اسی طرح ان کے جانشینوں اور متبعین کو ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔
مگر اس کے باوجود ان اولوالعزم اور باہمت حضرات نہ کبھی تھکاوٹ اور سستی کا شکار ہوئے، نہ ان کی ہمتیں پست ہوئیں اور نہ ہی انہوں نے اس راستے میں کمزوری دکھائی، بلکہ ہر مشکل و مشقت پر صبر کرتے رہے، لوگوں نے پتھر برسائے، انہوں نے دعائیں دیں۔ قرآن کریم میں بھی جا بجا انبیائے کرام کا ذکر آیا ہے، تا کہ اس امت کے لوگ انہیں مدنظر رکھ کر مایوس نہ ہوں۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ

ترجمہ: اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، نتیجتاً انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہنچیں، ان کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری، نہ کمزور پڑے اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا، اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔'' (سورۃ آل عمران: 146)

صبر کا دامن تھامے رکھنے سے محبت کی منزل (اللہ تعالیٰ کا دیدار) کا مل جانا آسان ہوتا ہے، اگر اس کی کوئی فضیلت نہ بھی ہوتی تو بس یہی شرف صبر کے لیے کافی تھا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاصْبِرْ صَبْراً جَمِيْلاً (سورۃ المعارج: 5)

ترجمہ: ''لہٰذا تم خوبصورتی کے ساتھ صبر سے کام لو۔''

اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ ہر وقت یہ دعا کرتا رہے:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْراً وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر کے پیمانے انڈیل دے اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے تابع دار ہوں۔'' (سورۃ الاعراف: 126)

دشمن سے پنجہ آزمائی کے وقت صبر کی ضرورت پڑتی ہے، تاہم دشمن سے مقابلے کی دعا نہیں کرنی چاہیے، البتہ یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ جب اس سے مقابلہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ صبر نصیب فرمائے۔

(18) دعا اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا

اب ہم سستی و کاہلی اور بے حسی سے نجات دلانے والے وسائل اور اسباب کے بیان کو یہاں ختم کرتے ہیں، آخر میں اس مہلک مرض اور وبا کے حوالے سے سب سے اہم اور سب سے مفید چیز یعنی دعا پر کچھ روشنی ڈالیں گے، تو اللہ تعالیٰ سے دعا ایک ایسا وسیلہ ہے، جس سے بظاہر ناممکن کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح سستی و کاہلی جیسی مہلک بیماری سے شفا پانے میں بھی دعا کا بہت اہم کردار ہے، بلکہ سابقہ جتنے بھی وسائل بیان کئے گئے ہیں، ان میں سب سے پرتاثیر چیز دعا ہے۔

دعا ایک مستقل عبادت ہے، بلکہ اسے عبادات کا مغز قرار دیا گیا ہے، دعا رب تعالیٰ اور بندے کے مابین ایک مضبوط رابطہ ہے، جس سے مخلوق کا ضعف اور کمزوری، جبکہ خالق کی قوت وقدرت، اس کی ربوبیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے، اس لیے قرآن کریم میں بہت سی آیات میں دعا کا حکم دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (سورۃ الغافر 60)

ترجمہ: ''تم مجھ سے دعا کیا کرو، میں تمہاری دعا کو قبول کرلوں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (سورۃ النمل:62)

ترجمہ: ''بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی دعا

کو قبول کرتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے۔''

یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ جس شخص کی جان کو خطرہ لاحق ہو، وہ زیادہ مصیبت زدہ اور پریشان حال ہے، یا وہ شخص جس کا دین تباہ و برباد ہو رہا ہو؟ دین کی مصیبت بڑی ہے یا دنیا کی مصیبت؟

ظاہر ہے کہ سستی و کاہلی نے جس کے دین کو داؤ لگا دیا ہو وہی شخص بڑی مصیبت میں ہے، اس کے مقابلے میں دنیاوی مصائب کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، جو دینی نقصان کی حقیقت کو سمجھ جائے تو دنیوی نقصان اسے ہیچ معلوم ہوگا۔

اللہ جل جلالہ کا ارشاد گرامی ہے:

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْیَةً (سورۃ الاعراف:55)

ترجمہ: ''تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو۔''

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ

ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ راہ راست پر آ جائیں۔'' (سورۃ البقرۃ:186)

سستی طاری کے وقت نبوی ﷺ تعلیم کیا ہے

نبی اکرم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ جب بھی ہم پر سستی طاری ہونے لگ جائے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

ان الایمان یخلق فی جوف احدکم کما یخلق الثوب فاسألوا لله ان یجدد الایمان فی قلوبکم

ترجمہ: ''بلاشبہ تم میں سے ایک شخص کے اندر کا ایمان ایسے ہی پرانا اور بوسیدہ ہو جاتا ہے جس طرح کہ کپڑا بوسیدہ ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے دلوں میں ایمان کی تجدید کرے۔'' (المستدرك للحاکم و الطبرانی)

سستی و کاہلی بھی ایمان کی کمزوری کے سبب طاری ہوتی ہے، اس لیے ایمان جب مضبوط ہوگا تو اس سے خود جان چھوٹ جائے گی۔

احادیث مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے سستی و کاہلی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ پناہ مانگنا خود دعا ہے۔

سستی و کاہلی سے بچنے کا پیغمبری ﷺ نسخہ

بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ پناہ مانگتے ہوئے فرماتے تھے:

اللھم انی اعوذ بك من الکسل و الھرم و المأثم و المغرم

(صحیح البخاری کتاب الدعوات، صحیح مسلم کتاب الذکر)

ترجمہ: ''اے اللہ! میں سستی سے، زیادہ بڑھاپے سے، گناہ میں مبتلا ہونے اور قرض دار ہونے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

حضور ﷺ نے خود بھی سستی و کاہلی سے پناہ مانگی ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بار ہا سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

اللهم انی اعوذبك من الهرم و الحزن، والعجز، والكسل، والبخل، و الجبن، غلبة الدين، و قهر الرجال

ترجمہ: ''اے اللہ! میں زیادہ بوڑھے ہونے سے، غمگین ہونے سے، عاجزی سے، سستی سے، بخل سے، بزدلی سے، قرضے تلے دبنے سے اور لوگوں کے غیظ و غضب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (صحیح البخاری، کتاب الجهاد)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ میں تمہیں وہی بات بتاتا ہوں، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، ارشاد فرماتے:

اللهم انی اعوذبك من العجز و الكسل والجبن و البخل

ترجمہ: ''اے اللہ! میں عاجز ہونے سے، سستی، بزدلی اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' (صحیح مسلم، کتاب الذکر)

بلکہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ دعائیں باقاعدہ سکھایا کرتے تھے، چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمناهن و نحن نعلمكموهن

یعنی: ''ہمیں یہ دعائیں رسول کریم ﷺ سکھایا کرتے تھے اور ہم تمہیں سکھاتے ہیں۔''

اس لیے سستی وکاہلی طاری ہونے کے بعد مومن کو اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اس سے گڑگڑا کر چستی ونشاط مانگتے رہنا چاہیے، اگر دعا کرنے والا اپنی دعا میں مخلص ہوگا یعنی واقعی اسے سستی سے نجات کی خواہش ہوگی تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمائے گا۔

نفس کے شرور سے اللہ کی پناہ مانگنے کی حقیقت

دعا کے باب میں اللہ کی پناہ مانگنا بھی شامل ہے، ہر لمحے اور ہر معاملے میں مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے، اس سے دعا مانگے، اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے، نفس جو شیطان کا بھائی ہے، اس کے شرور وفتن سے بھی اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے، نفس ہی سستی وکاہلی کی طرف مائل ہوجاتا ہے، اللہ کی توفیق اور اس کی مدد جب تک شامل حال نہ ہو، اس وقت تک مومن کچھ بھی نہیں کرسکتا، یہی تو وجہ ہے کہ ہمیں ہر نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، ہم سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں:

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (سورۃ فاتحہ: 5)

ترجمہ: ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔''

جو اللہ کی مدد سے محروم ہے وہ کسی صورت میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں ارشاد فرمایا:

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰی مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّ

لكن اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

ترجمہ: ''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک صاف نہ ہوتا، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاک صاف کر دیتا ہے، اور وہ ہر بات سنتا ہر چیز جانتا ہے۔'' (سورۃ النور: 21)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر حضرت فاطمۃ الزہر رضی اللہ عنہا کو تعلیم دی کہ وہ ہر صبح شام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ یا اللہ! مجھے ایک لمحے کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ فرما۔ یہی نفس کے شرور سے پناہ مانگنے کی حقیقت ہے، امام حاکم، امام نسائی اور امام بزار رحمہم اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا:

''تمہیں کونسی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ تم میری نصیحت عمل کرو؟ جب بھی تم صبح کرو یا شام کرو تو یہ کہا کرو:

يا حي يا قيوم! برحمتك استغيث، اصلح لي شأني كله، و لا تكلني الى نفسي طرفة عين أبدا

یعنی: اے اللہ! اے زندہ اور کائنات کو قائم رکھنے والی ذات! میں تیری رحمت کی فریاد کرتی ہوں، میری ہر حالت کو درست فرما، اور مجھے ایک لمحے کے لیے میرے نفس کے حوالے نہ فرما۔'' (اخرجه النسائي في اليوم و الليلة رقم: 570)

خاتمہ

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس کی توفیق اور مدد سے نیکیاں اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں، درود وسلام ہو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ پر اور آپ کی آل و تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر۔

درود وسلام کے بعد! گزارش ہے کہ زیر نظر کتاب میں سستی وکاہلی اور بے حسی جیسی مہلک مرض کے بارے میں آپ نے تفصیل سے پڑھا، اس کے اسباب وعلاج کے بارے میں آپ نے جان لیا، آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مرض انسان کی ذاتی ونجی زندگی سے لے کر معاشرتی اور سماجی زندگی کو خطرات سے دوچار کر دیتا ہے، یہ سب تفصیلات آپ کے سامنے آچکی ہیں۔

اب خاتمہ کے عنوان کے تحت ہم ایک اور اہم بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، اس حوالے سے بہت سے لوگ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ اہم بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی مرض لاحق ہو جائے تو فوراً اس کے علاج کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

اس میں غفلت کا مظاہرہ انسان کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر سکتا ہے، چونکہ سستی کی بیماری لاحق ہونے کے بعد انسان عبادت اور دعوت کے راستے سے آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا جاتا ہے، وہ دین سے انحرف کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے، جس کا وبال ناقابل برداشت ہے، اس لیے سستی کا علاج فوراً کرنا شرعی لحاظ سے بھی واجب ہے۔

بہت سے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سستی و کاہلی کا شکار ہو چکے ہیں، اس مرض کے لاحق ہونے کے اسباب بھی ان کو معلوم ہوتے ہیں، ان اسباب کو ختم کر کے اس مرض سے نجات حاصل کرنے کا حل بھی وہ جان رہے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی وہ غفلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے علاج شروع نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَاراً وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (سورة التحريم: 6)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔''

شریعت مطہرہ کا ایک مسلمہ اصول

یہ شریعت کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے، جس پر کسی واجب کی تکمیل کا دار و مدار ہو، اب سستی واجبات کی تکمیل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے اس کا علاج بھی واجب ہوا۔ واجب پر عمل کرنا مستقل نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے نیکیوں میں آگے بڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (سورة آل عمران: 133)

ترجمہ: ''اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور وہ جنت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تیزی دکھاؤ جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں آسمان اور زمین سما جائیں اور وہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

أُولٰئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ (سورۃ المومنون:61)

ترجمہ: ''اور وہ ہیں جو بھلائیاں حاصل کرنے میں جلدی دکھارہے ہیں اور وہ ہیں جو ان کی طرف تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔''

سستی وکاہلی کے مظاہر پر غور کرنے کے بعد جب یہ معلوم ہوجائے کہ اس مرض کے سبب مومن کسی گناہ میں مبتلا ہوا ہے تو فوراً توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، توبہ بھی ایک مستقل واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (سورۃ التحریم:8)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

ترجمہ: ''جو توبہ نہیں کرتا، سو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔''

اب سستی، کاہلی کی تباہ کاریوں سے نکلنے کی دو ہی صورتیں ہیں، اگر اس کے سبب گناہ میں مبتلا ہوا تو فوراً توبہ کرکے اس کی تلافی کی جائے اور سستی کے سبب کوئی نیک عمل رہ گیا، عبادت نہ کرسکا تو فوراً اپنے آپ کو خیر کے کاموں اور اعمال صالحہ میں لگادیا جائے۔

زیر نظر کتاب کو میں نے صرف علماء، طلبہ دین اور داعی حضرات کے لیے مرتب کیا ہے، اس لئے یہاں مخاطب بھی کتاب میں انہی کو کیا ہے، انہی کو سستی وکاہلی کے انجام

سے ڈرایا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مرض عوام الناس کے لیے مہلک نہیں ہے، جب خواص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تو عوام کا کیا پوچھنا، اس لیے اب طلبہ دین اور دعوت کے کام سے منسلک حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام الناس کو بھی اس خطرناک بیماری سے بچانے کی کوشش کریں، انہیں دعوت دیں کہ وہ سستی و کاہلی کو چھوڑ کر نیکی کے میدان میں سبقت لے جانے والے بنیں اور جو کمی کوتاہی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی کوشش کریں۔

علماء اور مرشدین و مربی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ سستی و کاہلی کے موضوع پر بھی وعظ و نصیحت کا اہتمام کریں، اس کے مظاہر و اسباب اور علاج کے طریقوں پر روشنی ڈالیں، اس سے بچاؤ کی تدابیر بیان کریں، اسی طرح اساتذہ کرام اپنے شاگردوں کو اس مرض سے بچانے کی کوشش کریں، تاکہ ان کی محنت رائیگاں نہ ہو۔

آخر میں، میں خصوصی طور پر مسلمان نوجوانوں کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ سستی و کاہلی کو بالکل اپنے قریب پھٹکنے نہ دیں، اس لیے کہ وہ عمر کے اس حصے میں ہیں، جس میں جوش و جذبے اور ہمت و ارادے بلند ہوتے ہیں، جسم و جان میں طاقت ہوتی ہے، سب کچھ کرنے کی قوت سے وہ مالا مال ہوتا ہے، اگر وہ اس عمر میں بھی سستی و کاہلی کا مظاہرہ کریں تو عمر کے اگلے مرحلے میں تو بس ان کا خدا ہی حافظ ہے۔

جوانی کی عبادت ہی اصل عبادت ہے، اسی نوجوان کو روز محشر عرش کا سایہ ملے گا، جس نے جوانی کی حفاظت کرتے ہوئے عبادت لی ہو، سستی و کاہلی کا شکار نہ ہوا، باقی بڑھاپے میں تو ہر کوئی عابد و زاہد بنتا ہے، شیر و بھیڑیئے کے منہ میں دانت اور پنجوں

میں طاقت نہ رہے تو وہ شکار چھوڑ دیتے ہیں۔

عمر کے اس قیمتی ترین حصے کو سستی و کاہلی کے ہاتھوں نقصان سے بچانے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے، مسلمان نوجوان کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں سستی وکاہلی اور بے حسی اس کے اندر سرایت نہ کر جائے اور غیر شعوری طور پر اس کے اعصاب پر سوار ہو کر انہیں شل نہ کر دے، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ملت اسلامیہ کے دشمنوں کی مراد بھر آئے گی، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس لیے کہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل کو اگر کوئی ناکام بنا سکتا ہے تو وہ مسلمانوں کی نوجوان نسل ہی ہے، نوجوان نسل کسی بھی قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے، اگر کسی کا سرمایہ ہی کھوٹا ہو جائے، تو اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔

اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، پھر اس قوم کے ساتھ دشمن کو کھل کر کھیلنے کا موقع ملتا ہے، اس کے بعد رونے دھونے کا کیا فائدہ، حسرت و افسوس کس کام آئے گا، دشمن کو ملامت اور لعن طعن کا نشانہ بنانے سے اس کا کیا نقصان ہوگا، حالانکہ دشمن کو موقع ہم نے خود فراہم کیا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (سورة آل عمران: 165)

ترجمہ: ”جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی جس سے دگنی تم (دشمن کو) پہنچا چکے تھے تو کیا تم ایسے موقع پر یہ کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے آئی ہے۔“

امت مسلمہ کی زبوں حالی کو دیکھ کر اس کے دکھ کا مداوا کرنے کے لیے یہ مختصر کتاب تالیف کی گئی، تا کہ مسلمان اپنی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب جوان کے اپنے اندر موجود ہے اسے دور کرنے کی کوشش کریں، بس یہ میری طرف سے انہیں ایک تنبیہ اور تبلیغ ہے، انہیں نصیحت و تعلیم ہے، ان کے ایک خطرناک اور موذی دشمن سے ڈراوا ہے۔

اے اللہ! میں نے اپنا کام پورا کرلیا، حق بات امت مسلمہ تک پہنچانے کی بساط بھر کوشش کی۔ اے اللہ! تو اس بات پر گواہ رہنا۔

وصلی اللہ و سلم علی نبینا و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔

آمین یا رب العالمین

ادارہ دعوت وتبلیغ کی انمول اصلاحی کتابیں